عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دور جدید

مرتب	بدل اشتراک	
اخوند زادہ حسین امام	ششماہی	پانچ روپیہ سالانہ
		تین روپے
جلد (۴) شمارہ (۳)	فی پرچہ	آٹھ آنے

صفر المظفر ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

اسلام اور سائنس۔	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۱ — ۲۲
زمزمۂ بقا۔	جناب اسد ملتانی	۲۳
اشتہار		۲۴
جدید مملکت پر اقبال کی تنقید۔	جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	۲۵-۵۲
عقیدہ و عمل۔	جناب مولانا اشتاق احمد صاحب افغان فاضل دیوبندیہ	۵۳-۶۲
تنقید و تبصرہ	ادارہ	۶۳-۷۶
لمعات	ادارہ	۷۷
اشتہارات		۷۸ — ۸۰

اسلام اور سائنس

(جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کی ایک تقریر)

برادران عزیز! جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اسلام اور سائنس"۔ سائنس سے یہاں مراد علم کیمیا اور طبیعیات Chemistry & Physics ہی نہیں جن کی طرف اس لفظ کے اطلاق سے بالعموم ذہن منتقل ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے تمام ان علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عالم حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفس انسانی سے۔ اس کرۂ عناصر کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا پھر کائناتِ زمین رنگو ساختہ اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، یہ علوم اور ان علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور علوم دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کچھ کہا یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درخشندہ عہدِ ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لا کر یہ نظر فریب اطمینان دلا دیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مردِ رہ چکے ہو۔ یہ داستان سنائی جائے اور اس کے خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستحرکہ افسوں خواب آور ہونے کی بجائے اہلِ بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔

وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیئے وہ تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور اثری اکتشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب و عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی یخ بستہ چوٹیاں بحر اٹلانٹک کی سی طغیانیاں تھیں آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے لیکن ان انقلابات ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا، جیسا ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہو جاتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور سے گذر نے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی بلکہ اس کی ذہنیت بھی کچھ ایسی پستی کے گڑھے میں گرتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے۔ اور رو بہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے توانہی کے نقوش قدم میں اور اس کو فلاح و بہبود کی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں توانہی کی کورانہ تقلید میں غرضیکہ وہ دیکھتی ہے توانہی کی آنکھوں سے سنتی ہے توانہی کے کانوں سے۔ اور سمجھتی ہے توانہی کے دلوں سے! اور خود اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ کان ہوتے ہیں مگر انسے سنتے نہیں وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امت مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

حضرات زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ زمانہ سے مراد آج اقوام یورپ ہی ہیں

کہ وہ ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سی سرعت کے ساتھ اُڑتی چلی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پس ماندہ اقوام پر ان کی اس محیرالعقول ترقی کا جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت پر اس کا خاص طور پر بڑا ہلاکت آفریں اثر پڑا ہے۔ اور اگر اس زہر کو، جو ملت اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جا رہا ہے جلدی زائل نہ کیا جائے گا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہر خاص کو ہی کھو بیٹھیں۔ یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا روڑا تھا۔ مسیحیت نے علمی ترقیوں کی کس قدر مخالفت کی۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیے، معلوم ہو جائے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ یگانے تھے) جس درندگی کا سلوک کیا ہے، قتل و خون ریزی کی بڑی سے بڑی خونچکاں داستانیں اس کے سامنے شرمندہ ہیں گلیلیو (Galileo) کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ اور اس نے دوربین کے ذریعے کوپرنیکس (Copernicus) کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوش غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور اس مجرم انکشاف حقیقت کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب اسے پیسا (Pisa) کے بلند مینار پر لے گئے کہ وہاں سے گرا کر اس ملحد کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایک پادری بھی ساتھ گیا کہ مرنے والوں سے گناہوں کے اعتراف کی آخری رسم ادا کرائی جائے۔ اس نے وہاں پہنچ کر کہا کہ اگر اب بھی کہہ دو کہ زمین ساکن ہے متحرک نہیں تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پرستار صداقت نے وہاں بھی کہہ دیا کہ ع

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

"مجھے تو اب بھی زمین متحرک ہی نظر آتی ہے" چنانچہ پیسا کا مینار آج تک اس کے خون ناحق کا شاہد ہے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی خلاف محل نہ ہوگا کہ مسیحیت کوپرنیکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں تھی؟ فلکیات کے متعلق حکمت یونان میں ارسطو کا نظریہ نہایت معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ اس نظریہ کی فیثاغورث وغیرہ نے اسی زمانے میں تردید کر دی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے اعتقاد میں جملہ کائنات میں اس کرہ کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے تھی جس پر

خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رو سے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی، اس لئے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔ ازاں بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں تو اس سے چونکہ مسیحیت کے اولین اعتقاد پر زد پڑتی تھی، اس لئے کلیسا نے اس کی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ "گلیلیو" بیچارے نے چونکہ علی وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لئے حوالۂ دار و رسن کر دیا گیا۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ اندھیر صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور متجدد پسند طبقہ پراٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس کے متعلق خود لوتھر (Luther) لولاک اور میلانکتھون (Melanchthon) وغیرہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑ دیتا تو اور کیا کرتا۔

ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو یہی مظاہر فطرت۔ جن سے کروڑوں کام لینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر۔ اگنی اور وائیو یانی۔ آگ اور ہوا، جن کو تابع فرمان بنا کر یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجا لانا پڑتا تھا جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور یہاں بھی قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب ہو نہ ہو ہمارے موجودہ نکبت و افلاس بہوط و تنزل، پس روی و تہی ماندگی کا واحد ذمہ دار ہمارا مذہب ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑ دیتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے" اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے اسلام کا غلط مفہوم ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب تو نہیں کہ نہ اس کی اصلی تعلیم کے ماخذ مل سکتے ہوں اور نہ اس کی علمی تاریخ میسر آسکے۔ انہیں چاہیئے تھا کہ یک طرفہ ڈگری

صادر کر دینے سے پہلے اسلام کو موقع تو دیتے کہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ وہ کتاب و سنت کو اٹھا کر دیکھتے۔ تاریخ امت کو ملاحظہ کرتے۔ اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے پھر تے۔ اگر اتنی تکلیف گوارا نہ فرمائیے تو یہ حقیقت ان پر واضح ہو جاتی کہ اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لئے کہ ان کا مذہب ان کی علمی ترقیوں کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں مذہب اوج کمال پر تھا۔ اوروں کو اگر ترقی کرنے کے لئے مذہب چھوڑنا پڑا ہے تو یہ ترقی کر ہی نہیں سکیں گے جب تک کہ حقیقی مذہب اسلام کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے یہ نہ تو محض ہماری خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی ضمنیات یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں۔ جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باب میں اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب ایک خدا پرست قوم نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادات پر مبنی ہوگا کہ کسی جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنایا اور اسے اس قدر شرف امتیاز بخشا ہے وہ امتیازی خصوصیت کونسی ہے؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے جب اس پیکر کو دیکھا۔ انہوں نے اس کے آب و گل میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں بھی دیکھیں۔ عرض کیا کہ بار الہا! کیا دنیا میں ایسا نائب بنایا جائے گا۔ جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل خونریزی کا مرتکب ہوگا؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح، تقدیس کرتے رہتے ہیں" اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم بہتر جانتے ہیں، جو تم نہیں جانتے لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکر خاکی خلافت ارضی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اللہ تعالےٰ نے نفس انسانی میں حقائق اشیاء کا علم ودیعت کر کے رکھ دیا۔ اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجود ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و مجد جس کی بنا پر انسان خلیفۃ اللہ فی الارض بنا علم حقائق اشیاء تھا یہی وہ علم الاشیاء ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت (Natural Science) سے تعبیر

کرتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی ایجاد بتاتا ہے حالانکہ اسلام نے صدیوں پیشتر اسے انسانیت کا امتیاز قرار دیا ہے
پھر علم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمایا کہ :-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۹:۳۹)

"کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں"

چنانچہ تحصیل علم کی تحریک و تحریص کے طور پر نبی اکرمؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ
"جو شخص طلب علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں"

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم پر کاربند ہوئی۔ اگرچہ علمی ترقیوں کی طرف رجحان تو بنی امیہ کے وقت سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ و بغداد وہ مرکز تھے جہاں سے آفتاب علم و فضل اقصائے عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لئے بہت بڑی فرصت درکار ہے اس لئے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم و فنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اس زمانہ کی ہیئت مجموعی سے کرنا چاہئے۔ آج دنیا من حیث الکل بہت ترقی کر چکی ہے اور ترقی کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہو چکا ہے۔ میں عہد اسلامیہ کی جس ترقی کا ذکر کر رہا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جس میں ابھی یورپ کا بیشتر حصہ بتوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجئے :-

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسےٰ اس (Survey Party) کے انچارج تھے نیز اس نے ستر علماء (Scholars) کی مدد سے کرہ ارض کا ایک نقشہ بنوایا۔ ان میں الخوارزمی بھی تھے جنھوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے جس میں آج تک کوئی ردوبدل نہیں کیا جا سکا۔ اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پاپیادہ

کیا اور اپنے مشاہدات قلم بند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابوبکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔

(۴) ادریسی بھی اس زمانہ کا مشہور جغرافیہ داں ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے صقلیہ سسلی کے عیسائی بادشاہ راجر دوئم نے اسے اپنے دربار میں بلالیا وہاں اس نے بادشاہ کے لئے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا اپنے مشاہدات۔ دوسرا ثقہ روایات اور تیسرا حصہ مطالعہ پر مبنی ہے۔

(۷) الخوارزمی نے اس زمانہ میں جبکہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپین نظریہ (AR I M) کہتے ہیں جس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا مشہور فلاسفر بیکن نے اس نظریہ سے استفادہ کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

(۲) جغرافیہ کے ساتھ ہی جہاز رانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانٹن تک جا پہنچے تھے اور وہیں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر انہی تجار کی بدولت پھیلا کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا کہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگا دیا وہ ایک عرب جہاز راں احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمرؓ و ابن العاص (عہد فاروقی) کے مجلۂ دماغ کا دین منت ہے

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ

اس بات سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور حربی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں مثلاً (Traffic) وہی لفظ ہے جو عربوں کے یہاں طریق (یعنی راستہ) تھا (Tariff) ان کے رسم الطریق سے نکلا ہے۔ (Magazine) عربوں کا مخزن (یعنی اسٹور) ہے (Cheque) جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے۔ صک کا تحریف ہے۔ اسی طرح (Cotton) ان کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ (Orange) واں کا نارنج (Lemon) لیموں اور (Saffaron) ان کے یہاں کا زعفران ہے۔ دس علی ہذا چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں مسٹر سلطبرون لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحر اطلانطک میں مختلف مقامات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

(۳) زمین کے بعد اہل زمین کے حالات یعنی علم تاریخ کو دیکھئے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ۔ فن تاریخ میں (جسے Froude نے تاریخ کی سائنس کہا ہے) آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اور جسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہد عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ لکھا تھا۔

(۴) اب فلسفہ اور لٹریچر کو لیجئے جو ایک مہذب قوم کے نظام حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج واشاعت ہوئی مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی۔ ابن سینا۔ ابن ارشد وغیرہم حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے سامنے کھول کر رکھ دیں حتیٰ کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے جملہ علوم وفنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے اس میں بھی جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستہ سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو (Alfonso the wise) نے مشہور فلاسفر ابوبکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندہ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر بار کم

ہے۔ تریب قریب یہی الفاظ ہسٹورینس ہسٹری اوف دی ورلڈ میں مسٹر ہمینڈ نے لکھے ہیں (Lewes) ہسٹری اوف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم امام غزالی کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

(۵) اب طب اور طبیعیات کو لیجئے: سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافات طبیعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بہ تمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ ایک قسطنطنیہ ہی کی قریب قریب ستر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف دھری رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہونچائی گئیں۔ اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں۔ اس کا اندازہ ہارون الرشید کے عہد کے مشہور سائنسدان حنین بن اسحٰق کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لئے عراق، شام، فلسطین اور مصر کا پیادہ سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لئے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۲۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جر ثقیل، مد و جزر، روشنی، آب و ہوا۔ فلکیات۔ معدنیات اور نباتیات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تیس برس کے عرصہ میں صرف ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق جمادیات کی تحقیق زلزلوں کے اسباب اصول آلات۔ تھرمامیٹر (مقیاس الحرارت) اور دیگر عناصر طبیعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے چودھویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقات علمی کے لئے قائم ہوئی تھی ایک سائنس کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جو ۵۲ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ، ا مقالات علم الفطرت

(Natural Science) کے متعلق ہیں۔

ابن خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کئے اور تعدیہ کے لئے حفظ ما تقدم کے اصول متعین کئے۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التاثیر۔ خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے۔

علمی میکانکس (علم الحیل) کے متعلق حکیم جزری نے تیرہویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے علمی میکانکس کے آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا۔ کاغذ آٹھویں صدی میں اسلامی ممالک میں رائج ہو چکا تھا۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال ہوتی تھیں چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب و غریب گھڑی تحفۃً شاہ شارلمین کو بھیجی تھی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا (Chemistry) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے انہوں نے ہی سب سے پہلے آتشیں مرکبات ایجاد کئے۔ تیزاب مثل نائٹرک ایسڈ ہائیڈرو کلورک ایسڈ، پوٹاس۔ امونیا۔ کلورائیڈ اوف مرکری۔ وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا۔ اور (Gasses) کی خصوصیات دریافت کیں (ملاحظہ ہو Intellectual Development of Eu) اب فلکیات کو دیکھئے۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (Observatory) قائم ہو چکی تھی جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہونچائی جاتی تھیں یحیٰی بن منصور اس رصدگاہ کے انچارج تھے۔ ان کی کتاب الاعمال، علم ہئیت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے یورپ ابھی کل تک بطلیموسی نظام کا قائل تھا جس کی رو سے زمین ساکن بتائی جاتی تھی لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں، اور اس کی جگہ اس نظام فلکی کی بنا ڈالی، جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے۔

علاوہ بریں مختلف علوم وفنون کے متعلق مسٹر ٹی. ایں. دسوانی. ایم. اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانے میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب ریاضی. فلسفہ اور دیگر علوم میں درس دینے لگے. وہ لوگ جہاز رانی کی ساخت. باغوں کی پرورش پھولوں کے تحفظ. لوہے اور پیتل کے ظروف. روئی اور ریشم کے کپڑے. طباعت و مرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے.

لیکن یہ سب علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات ان علماء اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سرانجام پاتے تھے. وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انہیں علمی کاوشوں پر آمادہ کرتی تھی. ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے. اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوت محرکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی. حقیقت یہ ہے کہ مذہب مسلمانوں کے نظام حیات میں ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے. جب تک دماغ روبہ اصلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن وخوبی کام کرتے رہتے ہیں. لیکن جب اس سرچشمۂ قوت و اصلاح میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے تو اعضاء و جوارح اگرچہ بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہوجاتی ہے. اس زمانہ میں چونکہ حرارت دینی نظام حیات میں فی الجملہ موجود تھی اس لئے ہر شعبۂ زندگی اپنی اپنی جگہ نشو و ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا. یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا. اس لئے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے. پھر وہ زمانہ کچھ آج کا نہ تھا کہ علمی ریسرچ کے لئے اس قدر آسانیاں موجود ہوں. آج کسی سکالر کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو. فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں اس کی مدد کے لئے تیار ہوجاتی ہیں. فنڈ جمع کئے جاتے ہیں. رفقائے کار رکیف پا بہ رکاب ہوتے ہیں. وہ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تب بھی ہالینڈ کا مکھن، لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی غرض سب کچھ وہیں ان کو پہونچتا رہتا ہے. لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم

کے لئے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ وضو کے پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دارالعلوم کا دروازہ چھوڑنا پڑا اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انہوں نے تحصیل علم کے لئے نو ہزار میل پیادہ سفر کیا۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لئے اکثر اوقات چالیس چالیس دن کا سفر کرنا پڑا۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے خاص نباتات کی تحقیق کے لئے روم، یونان اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹ رہی ہیں۔ لباس چیتھڑے ہو رہا ہے چہرے پر ضعف و نقاہت سے مردنی چھا رہی ہے لیکن سر میں ایک سودا ہے کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہونے دیتا اور ان کی یہ ہیئت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از دو نور عشق!
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر ست

تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس ہو یا تدبیر مملکت و تنظیم جیوش، علوم و فنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی کاوش سب منزلیں اسی جوش مذہبی کے جذبہ میں طے ہو جاتیں۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا تھیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اس لئے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تاکید کر رہا ہے۔ کہیں حکم ہے کہیں ترغیب و ترہیب، کہیں عدم تفکر پر مذمت۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور و ضابطہ تھا اور منازل حیات کے ایک ایک قدم پر وہ اس سے استشارہ کرتے تھے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ (۴۷:۱۰)

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گذر چکی ہیں۔ ان کا کیا انجام ہوا؟"

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن وہ دور عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا:۔

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتا۔ اور ان پر عمل نہ کر لیتا آگے نہ بڑھتا" (تفسیر ابن جریر)

انہوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا سیروا فی الارض سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور نظائر ارضی سے علم جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوام گذشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی تو علم تاریخ مرتب ہو گیا اور ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کو چشم عبرت سے دیکھا تو آثار قدیمہ کا علم وجود میں آ گیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔

انہوں نے اس آیت کو دیکھا۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۶ : ۷۹)

"کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو ہوا میں مسخر کئے گئے ہیں۔ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا۔ اس میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں"

اس میں غور کیا کہ ایمان والوں کے لئے جو اس میں نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ وہ کیا ہیں اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچے۔ انہوں نے کوشش کی اور جر ثقیل۔ مرکز ثقل۔ کشش ارضی کے سے نظریئے دریافت کئے۔ چنانچہ پروفیسر Deitrioi نے جو لکھا ہے کہ نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں" تو وہ انہی آیات پر تدبر کا نتیجہ تھا۔ اور یہی وہ نظریئے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی صورت

علم آپ کے سامنے ہے۔

انھوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ آسمانوں کے تمام کرّے آغازِ پیدائش میں ایک ہیولیٰ سے مرکب تھے پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کرّے بن گئے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ○ (۲۱: ۳۰)

"کیا ان لوگوں نے جو آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے؟"

آیت کے آخری ٹکڑے سے ان کی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا توام اولین پانی سے ہوا کیا رتق و فتق اور پانی کا مبداء حیات ہونا آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں ہیں۔ نظریۂ ارتقا Evolution Theory آج سائنس کی تحقیقات کا معرکۃ الآراء کارنامہ سمجھا جاتا ہے لیکن اہلِ علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اس کی ابتدا بھی مسلم ائمہ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہین کرم ہے۔ فارابی ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجہ اپنی تصانیف میں اس نظریئے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ کے ارتقائیوں نے ابتداء میں ضرور ان حکماءِ اسلام کے اشارات سے استفادہ حاصل کیا ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ حکمائے اسلام کے نظریئے کے مطابق تمام سلسلۂ نشو و ارتقا مشیت و ارادۂ باری تعالیٰ کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور مغرب کے سائنسدانوں کی تعلیم کی رو سے خدا کی ہستی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یہی اساسی فرق ہے اسلام اور مغربی سائنس میں۔

انھوں نے تکویرِ لیل و نہار اور تسخیرِ شمس و قمر پر غور کیا تو فلکیات کے راز ان پر منکشف ہو گئے۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ
عَلَى اللَّيْلِ ۖ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى (۳۹: ۵)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا۔ وہ رات (کی تاریکی) پر دن (کی روشنی) اور دن (کی روشنی) پر رات (کی تاریکی) چادر لپیٹ دیتا ہے اس نے سورج اور چاند کو مسخر

کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے"۔

جس نظام شمسی کی بنیاد انھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سرحد ہے چنانچہ کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کر کے علم ہیئت کی صحیح سمت کی طرف فارابی کی رہنمائی کی۔ فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریے کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارے کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارے کو ویگو کہتے ہیں لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶/۳۸)

"اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست علم والا ہے"۔

غرض کہ ان اہلِ نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیتِ الٰہی ایک خداوندی نشان۔ ایک راز فطرت مضمر ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برانگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے جنت نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں رات کی سیاہی میں شفق کی رنگینی میں، قوس قزح کی بہجت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں سمندروں کی گہرائیوں میں بادلوں کی روانیوں میں نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، انھیں صحیفۂ فطرت کے اوراق کھلے ہوئے ملتے۔ جو انہیں دعوت علم و عمل دیتے، کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲/۱۶۴)

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور رات دن کے آنے جانے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں۔ اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو ترو تازہ کیا اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے (رخ) بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید و معلق رہتے ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

ایک مسلمان کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر ایک محکم یقین رکھے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان

شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کر دے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے اس لئے کہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ اٹھتے، بیٹھتے چلتے پھرتے کارگہ ہستی پر غور کرے اور اس کی نگاہ دقیقہ رس پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہونچے جہاں ایک ہی قسم کے توام سے پھول کو شام جانفزا اور کانٹے کو نوک خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چلے اگر ہو تو گل بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوت نظارہ دے۔ بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی جڑاؤ چھت ایک مرصع کار کی تحسین تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضیکہ اس کا اٹھنا بیکار ہو نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت

بیٹھے تو عجز نقش کف پائے ہوئے　　　اٹھے تو درد دل کا بہانہ لئے ہوئے

اس لئے کہ اس کے خضر راہ کا ارشاد ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (۳:۲)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات دن کے آنے جانے میں۔ اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو لایعنی پیدا نہیں کیا:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا دعویٰ ہم اس وقت کر سکتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ہم دنیا کی ہر ایک چیز کو سودمند ثابت کر دکھائیں۔ اور "یہ علم حقائق اشیاء" اور "علم منافع اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

برادران سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر ایک چیز کی کنہ و حقیقت کو آشکار کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے لیکن دیکھئے تو یہی کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے۔ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے۔ کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے ایک جنگ چلی آتی تھی۔ لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ-

أَدْعُوا إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۲ : ۱۲)

"اے رسول کہہ دیجئے کہ میں اور میرے متبعین جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علی وجہ البصیرت دیتے ہیں"

"اسلام اور عقل" ایک مستقل عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً شرح وبسط سے کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسی اور فرصت میں گزارش کروں گا البتہ اس وقت توہم پرستی کے متعلق ایک واقعہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نبی اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس دن سورج کو گہن لگ گیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک، لوگ فوراً حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضورؐ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے کہ آپ کے غم میں اجرام فلکی نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "بھائیو۔ چاند اور سورج کا گہن قوانین قدرت کے مطابق عمل میں آتا ہے اس کا کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں" کیا توہم پرستی کی جڑ پر اس سے بھی زیادہ شدید کوئی ضرب لگائی جا سکتی ہے؟ اور یہ اس "روشنی" کے زمانہ سے تیرہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکے سے آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہونچ گئی تھیں پھر یورپ کے محققین اور حکمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے ان کے ذاتی کیرکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیرکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقوےٰ کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ یورپ میں بیکن کو علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ یورپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"نوع انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی۔ ابن تیمیہ۔ ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج تک سلام و رحمت سے لیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی

پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لئے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور...... میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالادست نہ کردیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے۔ اور اسی لئے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر سابقت کی فکر دامنگیر ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا؟ برعکس اس کے کہ مسلمانوں کی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر ان کا کیا اثر پڑا؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا اس لئے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی۔ مسز سروجنی نیڈو فرماتی ہیں۔

> "عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر و دولت کے لئے نہیں۔ ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لئے مرتے ہیں اور علاقوں کا رونا روتے ہیں مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا اور مسلم داعی یہی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عربوں نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کئے۔ انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہنود کے) وہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انہوں نے ڈالی۔ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں رکھا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان

---

[1] یہ تقریر موجودہ جنگ یورپ سے بہت پہلے کی ہے۔ پرویز

کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں "

(وکیل مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء)

یہ سب اس لئے تھا کہ انہوں نے علم کو ہمیشہ دین کے تابع رکھا۔ اور اس سے احکام خداوندی کے مطابق کام لیا۔

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند، روشن خیال طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جسکے نزدیک کسی شے کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکمار یورپ کی رائے ہے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریہ سے مطابقت پاجاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اس کا چرچا کرتے ہیں۔ اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے کسی نظریہ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس امر میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان، موڑ توڑ کر۔ قرآن کو یورپ کی ذہنی افتاد کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہاد عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات، خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں، جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہنچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں۔ کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لئے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنف حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے؟

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریئے کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ہزاروں

قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے کبھی تو ایک موجد کی زندگی میں ہی اس کا قیاس غلط ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اس کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہذا جو نظریہ آج قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ نظریہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں؟ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی آج تک کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔ یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جبکہ بعض حکمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفۂ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا۔ حالانکہ فلسفہ کے اصول ہمیشہ قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آج اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی علماء کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال کرتے تھے، ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ ان آیات قرآنی کو جن کی تصدیق کسی زمانہ کے قیاسی نظریوں سے نہ ہو سکے، متشابہات کے تحت رکھنا چاہیئے۔ اور ان کے متعلق یہ ایمان ہونا چاہیئے۔ کہ ان کی حقیقتیں بلاشک و شبہ صحیح و درست ہیں اور زمانہ کی ترقی سے ایک وقت آئے گا کہ شاہدات ان کی تصدیق کر کے انہیں محکمات کے زمرے میں داخل کر دیں گے۔

آخر میں ایک مختصر سی گذارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن بات چونکہ قرآن کی ہے اس لئے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جو علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس علم کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷:۳۶)

"جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو یاد رکھو! کان۔ آنکھ اور دل۔ ان سب سے باز پرس ہو گی"۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع۔ بصر اور قلب سلیم دیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے۔ علم کے یقینی مرتبہ تک نہیں پہونچتا۔ ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے اس میں غور فرمائیے کہ کتنا حصہ ظن و قیاس کا ہے اور کس قدر علم و یقین کا فلسفہ یونان منطق۔ علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان کی ہی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں۔ وہ بھی ایسی کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انھیں کوئی نہیں قبول کرتا۔ یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھار ہا مسئلہ پیش ہو جاتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہو سکتے ہیں یا نہیں" اب فلاسفرز کی ایک جماعت اثبات کی طرف اور دوسری نفی کی طرف ہو جاتی ہے۔ دلائل پر دلائل لائے جاتے ہیں منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں۔ حتیٰ کہ ان میں بیکن پیدا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرفہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی اور اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ علم کی اس تعریف کے بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ :-

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی اُدھر ہے
وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویہ نگاہ کو قرآن کریم کی روشنی میں بدلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے "علم دین" کہا جاتا ہے۔ اس سے مقصد ہی یہ ہے کہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں اسے شمع ہدایت بنا سکیں اور اس کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچیں لیکن اگر اس شمع کو ہم اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا لیکن منزل مقصود تک تو ہم نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں تو وہی پہونچے گا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا۔ اور علم دین امور دنیاوی میں اسی صورت میں کام آسکتا ہے جبکہ وہ اس قسم کا علم ہو جس کی تعریف قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔ اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علم فطرت کہا جاتا ہے۔ سو جب تک اس حصہ علم کی تکمیل نہ ہو اسلام کا کوئی عالم مکمل عالم نہیں بن سکتا۔ اسلام کے دور ترقی میں عالم کے لفظ سے کسی

زاہد گوشہ نشین کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ عالم اور حکیم سے مراد اس وقت وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکالر یا ڈاکٹر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ نظامیہ میں ایک طرف اگر امام غزالی دینیات کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہاؤالدین ریاضی اور تاریخ پر لکچر دیتے تھے۔ خود مساجد میں اس قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں لٹریچر اور طبعیات پر لکچر دئے جاتے تھے۔ اور اسی مکمل تعلیم کا اثر تھا کہ جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے، اور جن کے علمی کارنامے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان کر دیا) کی زندہ تفسیر ہے یقین مانئے اگر ہم بھی اپنے نظریئے کو بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف کو اپنے پیش نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ؎

زمیں از گردش تقدیر اگر دوں شود روزے
فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود نوے

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

زمزمۂ بقا

ہے خاک تغیّر کے سوا بادِ فنا میں؟ — پانی جو سمندر سے اُڑا، ہے وہ گھٹا میں
دنیا ہے تماشا گہِ نیرنگِ تغیّر — طوفانِ فنا موج ہے دریائے بقا میں
قانونِ فنا ڈھالتا رہتا ہے ہمیشہ — قوّت کو حرارت میں، حرارت کو ضیا میں
اے دوست! بظاہر جو فنا ہو گئی جل کر — موجود ہیں اس شمع کے ذرّات ہوا میں
سورج نہیں معدوم اگر ڈوب چکا ہے — اسوقت بھی ہے نصف جہاں اسکی ضیا میں
شبنم کے وہ قطرے جو اُڑے دامنِ گُل سے — رُوپوش ہوئے پردۂ آغوشِ صبا میں
اشعار جو نکلے کسی شاعر کی زباں سے — محفوظ ہوئے سینۂ اربابِ صفا میں
ضائع نہ گئی قوّتِ انگشتِ مغنّی — تبدیل ہوئی جنبشِ مضراب صدا میں
خامی ہے سماعت کی جو ہم سُن نہیں سکتے — بھرتا ہے ابھی نغمۂ داؤد ہوا میں
طے کرتے ہوئے عرصۂ ہستی کے منازل — ہم چھوڑتے جاتے ہیں نقوش اپنے فضا میں

اِک بار پھر اِس زیست کی تصویرِ مکمل
آئے گی نظر آئینۂ روزِ جزا میں

اسد ملتانی

طلوع اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ

گزشتہ دو سال میں سیاست ہندیہ میں مسلمانوں سے متعلق کون کون سے اہم مسائل پیدا ہوئے اور اہل الرائے حضرات نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں کس طرح دیکھا؟

اگر

آپ اپنے طور پر معلوم کرنا چاہیں تو آپ کو دقت ہوگی

لیکن

اگر آپ ہم سے دریافت کریں تو ہم بڑی آسانی سے آپ کو بتا سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ان پمفلٹوں میں موجود ہے جو اس دوران میں طلوع اسلام کی طرف سے شائع کئے جاتے رہے ہیں اور جو ہزاروں کی تعداد میں ملک میں تقسیم ہو چکے ہیں یہ پمفلٹس نہ صرف سیاست بلکہ دین کے اور شعبوں سے متعلق اہم مسائل پر بھی معلومات کا عمدہ ذخیرہ اپنے اندر رکھتے ہیں -

سٹ میں حسب ذیل پمفلٹ موجود ہیں

(۱) واردھا اسکیم اور مسلمان — ۴۴ صفحات ۲/
(۲) سوراجی مسلمان — ۳۴ صفحات ۲/
(۳) زبان کا مسئلہ — ۲۶ صفحات ۲/
(۴) خدا کی بادشاہت — ۲۰ صفحات ۲/
(۵) اسلام اور مذہبی رواداری — ۲۲ صفحات ۲/
(۶) متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی — ۶۲ صفحات ۲/
(۵) عرض داشت بخدمت علمائے کرام — ۳۴ صفحات ۱/
(۸) اشتراکیت اور اسلام — ۸۰ صفحات ۳/
(۹) مسلمان کی زندگی — ۲۲ صفحات ۲/
(۱۰) کانگریس بے نقاب — ۲۶ صفحات ۲/
(۱۱) راشٹرپتی مولانا ابوالکلام کا — ۳۶ صفحات ۱/
(۱۲) شخصیت پرستی — ۵۲ صفحات ۲/
(۱۳) علم حدیث — ۲۴ صفحات ۱/
(۱۴) جہان نو — ۸۰ صفحات ۳/
(۱۴) اسلامی معاشرت — ۵۲ صفحات ۳/

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ شمیم منزل شدی پورہ ۔ دہلی

جدید مملکت پر اقبال کی تنقید

(از جناب ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد)

[طلوع اسلام میں کبھی کوئی مضمون کسی دوسرے رسالہ سے نقل کرکے شائع نہیں کیا گیا۔ اس لئے نہیں کہ ہم اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ مہینہ بھر میں اس قدر اہم باتیں سامنے آجاتی ہیں کہ رسالہ کے محدود صفحات انہی کی کفایت بمشکل کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ بعض مضامین ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں جن کی افادیت میں قارئین طلوع اسلام کو شریک نہ کرنا بخل سا معلوم ہوتا ہے۔ بناء بریں علی قدر وسعت۔ ایسے اہم مضامین کی اشاعت کی بھی کوشش کی جائیگی۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی زیر نظر مضمون ہے۔ جو صاحب مضمون کے رسالہ "سیاست" کی تازہ اشاعت سے بمسرت نقل کیا جاتا ہے۔ بعض وضاحت طلب مقامات میں حواشی کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ طلوع اسلام]

انسان کی اجتماعی زندگی کا تین شعبوں کے تحت مکمل تجزیہ کرسکتے ہیں (۱) انتظام حکومت (۲) انتظام معیشت اور (۳) تدبیر منزل یا انتظام عائلی۔

متمدن انسان کسی نہ کسی نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا دنیا کی کسی کسی مملکت سے تعلق ہو۔ مملکت کے ذریعہ ہماری زندگی کی اہم اور فوری ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اگر مملکت نہ ہو تو ہماری حقوق و فرائض کی دنیا افراتفری میں مبتلا ہوجائے۔ جدید سیاسی تصورات کے مطابق مملکت انسانوں کی ایک ایسی جماعت سے عبارت ہے۔ جو کسی معین علاقہ میں قانونی اغراض کی تکمیل کے لئے منظم ہو اور جسمیں حاکم و محکوم کا تعلق عادتاً پایا جاتا ہو۔ مملکت کا خارجی مادی پہلو یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی نہ کسی مخصوص گوشہ یا رقبہ میں ہوتی ہے کہ بغیر اس کے ہم اس کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔ چنانچہ ایک ایسی جماعت جو منظم ہو لیکن کسی مخصوص خطہ پر کبھی آباد نہ ہو۔ جدید سیاسی اصطلاح کے مطابق مملکت نہیں کہی جاسکتی۔ مثلاً یہودی لوگ باوجود اپنی عالمگیر تنظیم کے مملکت سے تعبیر نہیں کئے جاسکتے۔ اس واسطے کہ وہ دنیا کے مختلف گوشوں میں منتشر ہیں۔

قیام مملکت کیلئے ظاہر ہے کہ انسانوں کی کچھ آبادی لازمی چیز ہے اور اسمیں نظم وحدت ہونا بھی ضروری ہے۔ مملکت افراد کو اپنے ضبط و نظم کا پابند کرتی ہے لیکن وہ خود کسی دوسرے مقتدر کی تابع فرمان نہیں ہوتی۔ ہر مملکت کیلئے خارجی سیاسی اثرات سے کامل طور پر آزاد ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کسی دوسری مملکت کے ارادہ کی پابند ہوگئی تو اس پر اصطلاحاً لفظ مملکت کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ مملکت اپنے منشا کو مؤثر بنانے کیلئے اپنا دربست جن افراد کے سپرد کرتی ہے وہ حکومت (گورنمنٹ) کہلاتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ مملکت کے ارادہ اور مرضی کو عملی جامہ پہنائے۔ حکومتوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن مملکت اس وقت تک قائم و برقرار رہتی ہے۔ جب تک کہ خارجی اثر یا اندرونی انتشار سے اسکی وحدت کو صدمہ نہ پہونچے اور اس کے تسلسل میں رخنہ نہ پڑے۔

جدید مملکت کی خصوصیات یہ ہیں (۱) مذہب و اخلاق سے بے تعلقی (۲) ہمہ گیر ہونا اور (۳) وطنیت کے تصور سے تقویت حاصل کرنا۔ اب ہم ان تینوں خصوصیات کے متعلق اقبال کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اقبال کے تمام تر خیالات کا سرچشمہ اسلامی تعلیم ہے وہ انسانی تمدن کے کسی شعبہ کے متعلق جب کبھی اظہار خیال کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی اسلامی اصول ہوتا ہے۔ جس کی کسوٹی پر وہ جدید تمدن کے اداروں کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

جدید مملکت کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہے۔ اس کو اس امر سے بحث نہیں۔ کہ اس کے ارکان کا مذہب کیا ہے۔ وہ کس کی عبادت کرتے ہیں اور کیوں؟ مملکت کے افراد کا ہم مذہب ہونا بھی کچھ ضروری نہیں جب تک لوگ اپنی شہری ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہوں۔ مملکت ان سے یہ نہیں دریافت کرتی کہ تم کس خاص مذہب یا نظام اخلاق کی پیروی کرتے ہو؟ جدید مملکت نہ صرف مذہب بلکہ اخلاقی بندھنوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتی ہے۔ مملکت کے اس تصور کا سب سے پہلا علمبردار میکیاولی ہوا ہے۔ جس نے سیاست کو مذہب و اخلاق سے جدا رکھنے کی تعلیم دی۔

میکیاولی کے پیش نظر سولہویں صدی عیسوی کی عیسائیت تھی جسمیں یقیناً کسی ذی فہم اور ہوشمند شخص کیلئے روحانی تشفی کا سامان مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ پھر اس کے سامنے شہنشاہ اور پاپائیت کی دائمی جنگ اور خود کلیسائی اداروں کے اندرونی انتشار اور زبوں حالی کے مناظر بھی ہوں گے جن کے باعث اس نے مذہب و اخلاق کی اجتماعی

حیثیت سے انکار کیا اور سیاست سے ان کا دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میکیاولی نے صاف صاف کہا کہ افراد چاہیں تو بے شک طور پر مذہب اخلاق کی پابندی کر سکتے ہیں۔ لیکن مملکت کو ان سے بالاتر ہونا چاہیے۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ اپنی بقا و استحکام کیلئے حصولِ قوت واقتدار کے لئے کوشاں رہے۔ چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ ہاں اگر مذہب و اخلاق سے سیاسی فوائد کے حصول میں مدد ملتی ہو تو عارضی طور پر انھیں اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میکیاولی نے اس ابن الوقتی کی حکمت عملی کو عین سیاست بتایا ہے جس پر ہر کامیاب مدبر اور سیاست کار کیلئے عمل کرنا ضروری ہے۔ پچھلی چار صدیوں میں میکیاولی کی تعلیم کو یورپ میں جو قبول عام نصیب ہوا اس کی وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس باطل پرست فلارنسوی حکیم کی تعلیم نے حیلہ اندازی کو فنِ لطیف بنا دیا اور سچ اور جھوٹ کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔ اقبال نے "رموزِ بیخودی" میں اس کی نسبت اس طرح ذکر کیا ہے۔

آں فلارنساوی باطل پرست ۔۔۔ سرمہ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہان نوشت ۔۔۔ در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت ۔۔۔ حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت
بتگری مانندِ آزر پیشہ اش ۔۔۔ بست نقشِ تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت ۔۔۔ فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد ۔۔۔ نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است ۔۔۔ حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت ۔۔۔ ایں خسک در جادۂ ایام ریخت

نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ کے اہلِ علم کی ذہانت وطباعی ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف ہونے لگی جو مملکت کو قوی کرنیوالے اور اسکی جنگی قوت میں اضافہ کرنیوالے تھے چاہے ان کو برتنے میں اخلاقِ انسانی کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ میکیاولی نے زمانہ پرستی کو اصول بنا دیا اور مملکت کو حق دیدیا کہ وہ اپنے استحکام کے لئے جو ذرائع بھی استعمال کرے وہ جائز ہیں۔ اس لئے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ ذریعہ۔ اگر کوئی مدبر اپنے اخلاقی اصول کی وجہ سے مملکت کو تھوڑا سا بھی عارضی نقصان پہونچاتا ہے تو میکیاولی کے نزدیک وہ مجرم ہے۔ میکیاولی نے اپنے خیالی بادشاہ

کے لئے جو آزادیاں روا رکھی تھیں وہ تھوڑے دنوں بعد یورپ کے مطلق العنان حکمرانوں اور جمہوری حکومتوں کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ جن کے خلاف ضمیرِ انسانی کو اپنی آواز بلند کرنا پڑی۔

یونان اور روما میں مذہب سیاست کو ایک دوسرے سے جدا نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ درحقیقت مذہبی سیاست کی ثنویت عیسائیوں کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ جبکہ قیصر اور خدا کے حقوق الگ الگ پورا کرنے کی دعوت دی گئی۔ نشاۃ ثانیہ تک باوجود مملکت اور کلیسا کی جدائی کے یورپ میں عالمگیر سلطنت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔ لیکن لیوتھر کی تحریک اصلاح مذہبی کے بعد مختلف قومی گروہوں نے قیصریت اور پاپائیت کے جوئے کو اتار پھینکا اور جدید مملکتوں نے جنم لیا۔ شروع میں مطلق العنان حکمرانوں نے جدید مملکت کے استحکام کے فرائض انجام دیئے اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد جمہوریت اور پارلیمانی نظامِ حکومت کو فروغ ہوا۔ مستبد فرمانرواؤں کے نظریۂ "حقوقِ ربانی" کی جگہ جمہوریت کے نظریۂ "معاہدۂ عمرانی" کا چلن ہوا۔ جو جدید عمومیت کا سنگِ بنیاد خیال کیا جاتا ہے لیکن اس تمام عرصے میں حکومت کی سربراہی چاہے مطلق العنان فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں رہی ہو یا جمہور کے قبضہ میں، ہر حالت میں مملکت کو مذہب و اخلاق سے جدا رکھنے کا میلان قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آج نوبت یہ پہونچی ہے کہ مملکت اس امر کی مجاز ہے کہ انسانوں کے بے زبان گلہ کو میکانکی طور پر اپنی قوت و اقتدار سے جدھر چاہے ہانکے۔ اگر مملکت افراد سے قتل و غارت کرانا چاہتی ہے تو ان کو کرنا ہوگا اور اگر وہ مذہب و اخلاق کے سارے ضابطوں کو توڑنے کی دعوت دے۔ تو اسمیں بھی کوئی عذر نہ ہونا چاہئے۔ مملکت کی قوت و جبروت کے فلک نما طلسم کو بے بس انسانیت آج غرزہ آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور چوں نہیں کر سکتی۔

یورپ میں مذہب و سیاست کی تفریق جس تصورِ حیات کے تحت عمل میں آئی۔ اس کی تہ میں رُوح اور مادہ کی ثنویت کا اصول کارفرما تھا۔ زندگی کے اس غلط نقطۂ نظر کے باعث انسانیت کا قافلہ مادیت کے بیابانوں میں آوارہ گرد ہے۔ اور اُسے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست بھی اسکی محتاج ہے۔ کہ اسکی تہذیب کی جائے۔ یہ کام مذہب اخلاق کے سوا اور کون انجام دے سکتا ہے؟ اسلام کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے ملک و دین کی دوئی کو ختم کر کے زندگی کی فطری وحدت کو قائم و برقرار کیا اور اخلاق و اقتدار کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا　　بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جسکو روح اور مادہ کی ثنویت میں نہیں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کل کو اگر اجزا میں بانٹا جائے تو اسکی اصلی حقیقت مسخ ہو جائیگی۔ ہم اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی اور معنوی نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو در اصل ہمارے عقائد کا عکس ہوتا ہے۔ اگر نیت کا روحانی سرچشمہ گدلا ہو جائے تو جو اعمال صادر ہوں گے وہ گندے اور خلوص و حقانیت سے معرا ہوں گے۔ افراد کی طرح اقوام کو بھی اخلاق کا پابند ہونا چاہئے۔ ورنہ اجتماعی اعمال میں پراگندگی لازمی ہے۔ سعی و عمل کی دنیا میں اس کا امکان بظاہر نظر نہیں آتا کہ انسان اپنی اجتماعی زندگی میں اخلاق سے بے نیاز رہے اور انفرادی زندگی میں اس پر عمل کرسکے۔ اگر سیاست میں ظلم اور خود غرضی روا رکھی جائیگی تو ضرور ڈر ہے کہ اس تمدن کے سایہ میں جو افراد زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بے مروتی خود غرضی سے پیش آئیں اور اسطرح اپنے وجود کی معنوی تنظیم کو تہ و بالا کردیں۔ ہمارا زندگی کا مخصوص نقطۂ نظر ہمارے سارے اعمال میں موجود رہے گا۔ چاہے ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ سیاست و اخلاق کی تفریق اور بے تعلقی کے باعث جدید تمدن اپنی روحانی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے اور اسکی وجہ سے جو غیر متوازن صورت حالات پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا گیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

تمدن کا صحیح توازن اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جبکہ امور مملکت بھی اسی طرح نظام اخلاق کے پابند ہوجائیں جس طرح افراد ایک مخصوص ضابطہ پر عمل پیرا ہو کر اپنی مخفی قوتوں اور قابلیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اخلاق و سیاست کی تفریق کسی ایک قسم کے نظام حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ آج ہر نوع کی حکومت میں آپ کو جدید تمدن کا یہ مخصوص مظہر نظر آتا ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انسانیت کی فلاح اس میں ہے کہ دین و دنیا اور اخلاق و سیاست ساتھ ساتھ رہیں - اور قوت و جبروت اور عجز و انکسار ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوں - جنیدی و اردشیری کے امتزاج ہی سے ایسا نظام فکر و عمل وجود میں آسکتا ہے، جس کی بدولت انسانیت اپنی تقدیر کی تکمیل کر سکتی ہے - جدید تمدن کی سیاست ایک دیو بے زنجیر ہے کہ جدھر رُخ کرتا ہے اپنے جلو میں تباہ کاریاں چھوڑ جاتا ہے

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں   کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد   فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

اخلاقی پابندیوں سے آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مملکت اپنے تئیں ہمہ گیر خیال کرتی ہے - وہ چاہتی ہے کہ فرد اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے اور اپنی تمام خواہشوں کو اسکی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائے - اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو - مانگے تو اُسی سے مانگے اور جھکے تو اُسی کے آگے جھکے - جدید مملکت عہدِ حاضر کا سب سے بڑا بت ہے - آج وہ فرد سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے - اور وہی مرتبہ حاصل کرنا چاہتی ہے جو مذاہب میں ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل ہے -

اقبال نے مملکت کے اس نئے بُت کا پول کھولا ہے - اس کے نزدیک اس سارے طلسم کے پیچھے ایک بردست فریبِ نظر کا حجاب پڑا ہوا ہے - اگر وہ پردہ اُٹھ جائے تو وہاں کچھ بھی نہیں - اپنی نظم "معزولِ شہنشاہ" میں اس نے اسرارِ ملوکیت کو اسطرح فاش کیا ہے -

ہو مبارک اس شہنشاہِ نکو فرجام کو   جسکی قربانی سے اسرارِ ملوکیت ہیں فاش
شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بُت   جسکو کرسکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کیلئے   ساحرِ انگلیش! مارا خواجۂ دیگر تراش

مملکت کے ہمہ گیری کے دعوں کو اقبال صحیح نہیں سمجھتا - مملکت ایک انسانی ادارہ ہے، جو انسانوں کی خدمت کے لئے وجود میں آیا ہے - وہ مقصود بالذات نہیں کہی جاسکتی - مملکت محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے - اس میں الوہیت کی شان پیدا کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہے - اس ضمن

میں اقبال کے تصورات اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہیں۔ اسلام میں اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی اور ابدی اور واجب بالذات ہے۔ وہی کائنات کا حقیقی حکمراں ہے۔ جسے چاہتا ہے حکومت نوازش کرتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ذلیل وخوار کرتا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ اپنے مقررہ قانون کے مطابق کرتا ہے۔ جسمیں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا سوائے اس کے کائنات ہستی میں کوئی مقصود بالذات نہیں ہے۔ مملکتی قانون اس وقت تک قابل احترام ہے۔ جب تک کہ وہ حق کے موافق ہے۔ حق قانون سے پیدا نہیں ہوتا۔ قانون حق پر مبنی ہونا چاہئے۔ جو واجب تعالیٰ کی عین مرضی ہے۔

قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں اسلامی نظریہ مملکت کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ جن سے مسلمان اپنا فلسفۂ سیاست اخذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہاں چند آیات شریفہ نقل کی جاتی ہیں۔

مالھم من دونہ من ولی ولا	اس کے سوا بندوں پر کوئی مختار نہیں اور وہ اپنے
یشرك فی حکمہ احداً (الکہف)	حکم (اقتدار) میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔
یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید لم	وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے
یکن لہ شریك فی الملك	حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔
ان الحکم الا للہ	کسی کا حکم نہیں سوائے اللہ کے۔
فتعلی اللہ ملك الحق	بزرگ وبرتر ہے اللہ جو حقیقی حکمران ہے۔
الیس اللہ باحکم الحاکمین	کیا اللہ بہترین حاکم نہیں ہے۔
فالحکم للہ العلی الکبیر... (المومن)	حکم تو وہی ہے جو خدا کا ہے جو عظمت والا بڑا ہے۔
الا لہ الحکم	بیشک اقتدار تو اسی کا ہے۔
الم تعلم ان اللہ لہ الملك	کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین اور آسمان کی حکومت
السمٰوات والارض	اللہ ہی کی ہے۔

ان آیات شریفہ سے بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ قرآنی تعلیم کی رو سے حکمرانی اور فرماں فرمائی کا حقیقی

حق صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔ کہ اس سے بڑھ کر انسانی فکر و عمل کی رہنمائی کوئی نہیں کر سکتا۔ باقی سب پابندیاں اعتباری اور عارضی ہیں۔ انسان صرف اپنے اخلاقی نصب العین ہی کے آگے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ اقبال نے "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے کرتے ہوئے نہایت ہی لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اسلام بہ حیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے اور چونکہ ذات باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے۔ اس لئے اسکی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے۔"[1]

اقتدار کا یہ نظریہ جدید مملکت کے معاہدہ عمرانی کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ جس کی رُو سے مشیت عامہ جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے۔ مملکتی اقتدار کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ نظریہ معاہدۂ عمرانی کے علمبرداروں میں ہابز اور لاک کے علاوہ فرانسیسی مفکر روسو ہے۔ جس نے عوام کو اقتدار و حقوق کا سرچشمہ قرار دیا

[1] یہ چند جملے اقبال کے فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ الہیات دونوں میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اصل انگریزی عبارت یہ ہے۔

"Islam, as a polity is only a practical means of making this principle (Tauhid) a living factor in the intellectual and emotional life of mankind. It demands loyalty to God, not to thrones, and since God is the ultimate spiritual basis of all life, Loyalty to God virtually amounts to man's loyalty to his own ideal nature."

The Reconstruction of Religious Thought in Islam, P. 140)

[اس معیاری فطرت یا "آئیڈیل نیچر" (اعلیٰ صفات) کا تعین قرآن کریم سے ہوتا ہے۔ "طلوع اسلام"]

اس کی کتاب "معاہدۂ عمرانی" انقلاب فرانس کی انجیل خیال کی جاتی ہے۔ روسو کی تعلیم سے انقلاب فرانس کے بیشتر قائد متاثر تھے۔ اسی تعلیم پر بعد میں جمہوری حکومتوں کا نظام فکر مبنی قرار دیا گیا۔ جب عوام دنیاوی اقتدار کا سرچشمہ ٹھہرے۔ تو ظاہر ہے کہ اکثریت کا حکم چاہے وہ ناواقفیت اور نادانی کے باعث غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔ مطلق اور بے قید تسلیم کیا گیا اور انسانی ضمیر کی آواز جو ہمیشہ حق کی تائید میں بلند ہوتی ہے اور جس پر انسانیت کی سیاسی اور عمرانی ترقی کا دار و مدار ہے اکثریت کے فیصلے کے نیچے دبادی گئی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا کوئی طرز مطلق حیثیت نہیں رکھتا۔ حکومت ایک بااختیار شخص کی یا متعدد بااختیار اشخاص کی یا بہت سوں کی اچھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ عدل و اعتدال کے اصول پر مبنی ہو اور الٰہی قوانین سے چشم پوشی نہ کرے جو فطری قوانین ہیں اور جنھیں ہر جماعت اپنے مزاج اور اپنے احوال کے مطابق برت سکتی ہے۔ اگر بجائے مشیت عامہ کے یہ تسلیم کیا جائے کہ اقتدار کا ماخذ ذات باری ہے تو اس سے انسانی ضمیر کی آزادی کا اصول بھی مسلم رہتا ہے۔ کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے ذریعہ ہی سے قانونِ الٰہی کی توجیہ کا مجاز ہے۔ اور جماعت کی عام ترقی کے راستے بھی مسدود نہیں ہوتے۔ حضرت معین الدین چشتی کی طرف ایک رُباعی منسوب ہے۔ جس میں اسوۂ حسینی کی اصولِ توحید کے مطابق توجیہ کی گئی ہے۔ اور اسے انسانی ضمیر کی آزادی کے لئے بطور نصب العین کے پیش کیا گیا ہے۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین ‏ ‏ ‏ دین است حسین دین پناہ است حسین
سرداد نداد دست در دستِ یزید ‏ ‏ ‏ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

اقبال کے نزدیک ملکی اقتدار کا ماخذ ذات باری ہے نہ کہ کوئی فرد اور نہ کوئی جماعت، چاہے وہ کسی خاص نقطۂ نظر کے متعلق کتنی ہی اکثریت کیوں نہ رکھتی ہو۔ وہ اصلی حاکم اس کو مانتا ہے، جو دنیاوی اعتبارات و تقیدات سے پاک اور بذاتہٖ مطلق محض ہو کہ اسی کے آگے فطرت انسانی اپنی جبینِ نیاز جھکا سکتی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ‏ ‏ ‏ حکمراں ہے بس وہی باقی بتانِ آذری

دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ حاکمی کے لئے اگر فوج اور زندان و سلاسل معیار ہیں تو یہ بہت

پست قسم کے معیار ہیں۔

فوج و زندان و سلاسل رہزنی است | او ست حاکم کز چنیں ساماں غنی است

جمال الدین افغانی کی زبانی اسی مسئلہ کے متعلق یوں کہلوایا ہے۔

غیر حق چوں ناہی و آمر شود | زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیر گردوں آمری از قاہری است | آمری از ماسوا اللہ کافری است

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال ہمیں نراج کے راستہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور اس کا قائل ہے۔ کہ انسانی فطرت اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے۔ انسانوں کے ذہنی اور اخلاقی قویٰ بغیر مملکت کے وجود کے نشوونما نہیں پا سکتے۔ جب تک عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لئے کوئی نہ ہو، جو مفاد ملکی کی نگہداشت کر سکے۔ اس وقت تک معاشرہ ترقی تو کجا اپنے آپ کو قائم و برقرار نہیں رکھ سکتا۔ حکومت کسی ایک مخصوص طرز کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ مختلف حالات کے مطابق مختلف حکومتیں ممکن ہیں جو حق اور عدل پر مبنی ہو سکتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک مملکت کی اطاعت غلامی نہیں۔ بلکہ خود انسانی نفس کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہے۔ اس طرح آدمی آدمی کا نہیں بلکہ الٰہی قوانین کا تابعدار ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اکی انسانیت اور شرافت کو بٹا نہیں لگتا۔ حکمراں کی عزت و احترام وہ اس واسطے کرتا ہے۔ کہ وہ فطری حقوق اور الٰہی نوامیس کا پاسباں ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ قوت و جبروت کا مالک ہے۔ زندگی کے اسی نقطۂ نظر کے باعث اسلامی تاریخ نے آزادی و خودداری کی روایات کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ اور اس کی بدولت مرد مومن کی سیرت میں بے نیازی اور بے خوفی ہمیشہ موجود رہی۔ سیرت کے اس اعلےٰ وصف کو اقبال فقر سے تعبیر کرتا ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ | فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

فقر مقام نظر، علم مقام خبر | فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور | اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰه

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

اسلامی تاریخ میں یہ امر مسلم رہا ہے کہ حاکم حکمرانی کا مستحق واہل اس وقت تک ہے۔ جب تک کہ وہ انسانی صفاتِ عالیہ کا نگہبان ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبۂ صدارت میں بصراحت موجود ہے۔

ایھا الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اساءت فقومونی، الصدق امانة والکذب خیانة والضعیف فیکم قوی عندی حتٰی اخذ له حقه والقوی ضعیف عندی حتٰی اخذ منه الحق اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فاذا عصیت الله ورسوله فلا طاعة لی علیکم

(اے لوگو میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مدد کرو۔ اگر میں برائی کروں تو مجھے تنبیہ کرو۔ سچائی امانت ہے۔ اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ جب تک کہ اس کا حق نہ دلوا دوں[1] اور قوی ضعیف ہے۔ جب تک کہ اس کمزور کا حق نہ لے لوں[2]۔ میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک کہ میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہوں۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں)

غرض مملکت یا حکومت کا اقتدار اور اس کا ہمہ گیری کا دعویٰ اسلامی روایات میں ہمیشہ مشروط رہا ہے۔ الحکم للہ اور الملک للہ کا فلسفہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسانی صفاتِ عالیہ[1] ہی اس امر کو معین کرنے کی مجاز ہیں کہ کونسا طرزِ حکومت کن حالات کے لئے موزوں اور قرینِ عدل ہے۔ عدل سے مراد ایسا نظامِ حیات ہے جس میں جماعت کے ہر رکن کو اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا پورا موقع ہو اور وہ اجتماعی زندگی میں وہی حصہ اور مرتبہ حاصل کر سکے جس کا وہ فی الحقیقت مستحق ہے۔ بغیر اس کے کوئی مستحکم تمدن اور وسیع تہذیب وجود میں نہیں آ سکتی۔

---

[1] جسے قرآن کریم تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے اور انہی حضرات کو قیامِ حکومتِ الٰہیہ کا اہل قرار دیتا ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہوں۔ "طلوعِ اسلام"

ف[1] یہاں تک کہ اسے اس کا حق دلواؤں۔ طلوعِ اسلام

ف[2] یہاں تک کہ اسے غریب کا حق لوں۔ طلوعِ اسلام

اس اصول کو تسلیم کرنے سے سیاست کسی بندھے ٹکے نظام فکر کی پابند نہیں ہو جاتی۔ بلکہ زندگی کی طرح وہ مختلف احوال کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ ہمارے سیاسی نظامات جنھیں آج مطلق حقائق کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ خاص حالات کا نتیجہ ہیں۔ وہ سب کے سب آنی و فانی ہیں۔ ان میں کوئی بھی دائمی اور مطلق محض نہیں۔ باقی رہنے والی صرف ذات خداوندی ہے۔ "ضربِ کلیم" میں محراب گل افغان کی زبانی اقبال نے نہایت بلیغ اشعار کہلوائے ہیں۔ محراب گل افغان کہتا ہے۔ کہ افغانستان کی چٹانیں عالم سیاست کے عجیب عجیب انقلاب دیکھ چکی ہیں۔ انھوں نے سکندر کو بھی دیکھا۔ اور نادرشاہ کو بھی۔ لیکن فاتحوں نے جو نظامِ حکومت قائم کئے وہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوئے۔

کیا چرخ کجرو، کیا مہر، کیا ماہ	سب راہرو ہیں واماندۂ راہ
کڑکا سکندر بجلی کی مانند	تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ!
نادر نے لوٹی دلی کی دولت	اک ضربِ شمشیر! افسانۂ کوتاہ!
افغان باقی، کہسار باقی	الحکم للہ! الملک للہ!

جدید مملکت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نظامِ فکر کو وطنیت کے فلسفۂ اجتماعی پر مبنی قرار دیتی ہے۔ وطنیت ہی اس کا دین ہے اور یہی اسکا ایمان ہے۔ اپنے اعمال کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے وہ وطنیت کے جذبہ کا سہارا لیتی ہے۔ جب مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو ضرور تھا۔ کہ کوئی دوسرا مسلک یا زندگی کا نقطۂ نظر اس کی جگہ لیتا ہے۔ وطنیت کے تصور نے بڑی حد تک اس روحانی اور معنوی خلا کو اہل مغرب کی زندگی میں پر کیا جو ترک مذہب سے پیدا ہو گیا تھا۔ نظری حیثیت سے اصول قومیت کا تعلق انسانوں کی سیاسی گروہ بندیوں سے ہے۔ اس کے ذریعے سے اس تاریخی رجحان کا اظہار عمل میں آیا جس کا مقصد مسیحی عالمگیر مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے آزاد اکائیاں قایم کرنا تھا اسکی بدولت ایسی نئی سیاسی تنظیم وجود میں آئی۔ جس سے مختلف گروہوں کی نسلی اور لسانی انفرادیت برقرار رکھی جا سکے۔ اور ان میں سیاسی اور معاشی تعاون عمل کی راہ پیدا ہو اور سبھوں

کی دولت میں اضافہ ہو۔ اس تعاون عمل کی بہترین شکل یہ خیال کی جاتی ہے کہ ہر مملکت قوم ہو اور ہر قوم مملکت ہو۔

وطنیت کے تصور کا اظہار سیاست کے ذریعہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوا اور انقلاب فرانس نے اس تصور کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ بعد میں وطنیت کا اظہار مخصوص تہذیبوں کی ادبی، تاریخی اور لسانی خصوصیات کے ذریعے سے کیا گیا۔ وطنیت کے جذبہ کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ایک مشترک سیاسی ہیئت میں منسلک ہو گئے اور تاجرانہ نفع پرستی کی گرم بازاری کیلئے اہل مغرب کے لئے حالات بہت سازگار ثابت ہوئے۔ شروع شروع میں نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو جدید مملکتیں قائم ہوئیں انھیں وطنیت کے جذبہ سے معاشی مفاد کو فروغ دینے میں بہت کچھ مدد ملی۔ اس جذبہ کے نشوونما میں بادشاہوں کا بڑا حصہ رہا۔ بالخصوص انگلستان اور فرانس میں قومیت انھیں کی مساعی کی رہین منت ہے۔ بالآخر قومیت کی قبا اہل مغرب کے جسموں پر ایسی چست ہوئی کہ اس کو بالکل فطری خیال کیا جانے لگا۔ ہر جماعت قومیت یا وطنیت ہی کی بنیاد پر اپنی سیاسی اور معنوی تنظیم کرنے کی دعویدار ہوئی۔ قومی اقتدار معاشی قوت و نفوذ حاصل کرنے کا ذریعہ ٹھہرا۔ اور معاشی قوت سے قوموں کے سیاسی اقتدار میں اضافہ ہوا۔ ہر قومی مملکت اپنے معاشی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے معتمد کی تشکیل و تکمیل کے درپے ہو گئی، بلا لحاظ اس امر کے کہ دوسری جماعتوں پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔ جب ہر مملکت جو وضع قانون کا حق رکھتی ہے خود ہی اپنے حلقۂ عمل کا تعین کرنے لگی تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے میں اتنی عسکری قوت پیدا کرنے پر مصر ہوئی جو اسے اس کی دانست میں دوسری قوموں کی دست درازی سے محفوظ رکھ سکے۔ اور اپنے من مانے حقوق منوا سکے۔

مملکت کے جدید تصور میں قومی احساس کی کارفرمائی کا بڑا حصہ ہے۔ جس کی بدولت ہر چھوٹی سی چھوٹی قوم اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کی دعویدار ہے۔ آج یہ سیاست کا ایک مسلم اصول موضوعہ مانا جاتا ہے۔ کہ جہاں تک ہو سکے مملکت اور قوم ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے پائیں۔ ان کے

حدود ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں بلکہ ایک ہوں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ قوم کا تصور اب تک بہت غیر متعین اور مبہم طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کی تہ میں اصلی خیال یہ ہے کہ جس جماعت میں لسانی، نسلی اور تہذیبی یگانگت ہو۔ اس کیلئے بڑی حد تک ضروری ہے۔ کہ اس کے سیاسی اور معاشی مفاد میں اشتراک پیدا کیا جائے۔ چنانچہ جدید قومیت ایک قسم کا نفسیاتی احساس ہے۔ اور مملکت ایک معروضی حقیقت ہے، جو اپنے ارادہ اور منشا کو عملی جامہ پہنانے کی قوت رکھتی ہے۔ قومی مملکت بہترین سیاسی تنظیم ہے۔ جو اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا محرک عمل ہے۔ آج اس نے دین و اخلاق کی گدی پر قبضہ جمایا ہے۔ مملکتی نظم و نسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبہ کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ جسے دوسری قوموں سے معاشی معاملے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ آج قومیت یا وطنیت کا سیاسی تصور مملکت کی فطری بنا رخیال کیا جاتا ہے۔ اقبال اس تصور کو اسلامی روایات کا نقیض خیال کرتا ہے۔ اور اس نئے بت کو توڑنا اپنا سب سے بڑا اسلامی فرض سمجھتا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہی جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ وطنیت کا جذبہ محض ایک مصنوعی چیز ہے۔ جدید تمدن کے بعض مخصوص حالات نے اس کی پیدائش و نشو و نما میں مدد دی یہ دعویٰ کہ جسطرح انسان کو اپنے خاندان یا قبیلہ

سے محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ محبت بڑھ کر قوم و وطن کی محبت بن جاتی ہے تاریخی و منطقی طور پر صحیح نہیں ہے۔ خاندان کی محبت ایک قابلِ احساس جذبہ کے تحت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے وطنیت ایک پیچیدہ اور تجریدی احساس ہے۔ جسکو صرف مخصوص تاریخی احوال اور معاشی تعلقات کی بدولت جذباتی حقیقت بننے کا موقع ملتا ہے۔ اور جہاں تاریخی حالات موافق نہیں ہوتے وہاں اس کے لئے باوجود معاشی مفاد کی یکسانیت کے جذباتی حقیقت بننے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ خود ہندوستان کی مثال اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے۔

نسل زبان، سیاسی اور معاشی وحدت اور رسوم و روایات کی یکسانیت وطنیت کے جذبہ کے پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی عنصر بھی اجتماعی زندگی کی اساس نہیں کہا جاسکتا جسکے بغیر کسی گروہ کی معنوی تنظیم محال ہو۔ دراصل وطنیت کا جذبہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات سے پیدا ہوا۔ اس کی عمر دو سو ڈھائی سو برس سے زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن اس عرصہ میں اس نے بے پناہ قوت حاصل کرلی ہے۔ وطنیت اس قوت کو نہایت ہی پست مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتی۔ اس نے من مانے طور پر اپنے اقدار حیات بنائے ہیں۔ جنھیں وہ حق و باطل کا معیار خیال کرتی ہے۔ اس اندھے جذبہ کے تحت قومیں یہ بھول گئیں کہ جسطرح انفرادی زندگی میں خواہشوں اور میلانوں کی تحدید سے اخلاق و تمدن پیدا ہوئے۔ اسیطرح جب تک قومیں اپنے اعمال پر تحدید حاصل کرنا نہیں سیکھیں گی اس وقت تک یہ دنیا اسی طرح جہنم زار بنی رہیگی جیسی کہ آجکل بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے قدیم آریاؤں، یونانیوں اور جاہلیت کے عربوں میں اس قسم کے تصورات ملتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بولنے والوں کے علاوہ دوسروں کو وحشی سمجھتے تھے۔ اس قسم کی فوقیت کا احساس اسلام سے قبل اکثر گروہوں میں موجود تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے ان نسلی اور نسبی فضیلتوں کو معدوم قرار دیا۔ جن کی وجہ سے شرافت اور بزرگی کسی خاص قبیلہ یا گروہ کی طرف منسوب ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ اس نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کہکر انسانی اعمال کو شرف و احترام کا مستحق

ٹھہرایا۔ نہ کہ نسلی و نسبی تعلق کو۔ اسلامی روایات میں وسیع تر انسانیت کا تصور پیش نظر رہا نہ کہ مخصوص اور محدود گروہوں کا۔ مخصوص گروہ تو اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ آپس میں پہچانے جا سکیں۔ جیسا کہ آیت شریفہ میں ہے۔

یاایھاالناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور پھر تمہاری قومیں قبیلے بنائے۔ تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے)

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلعم نے نسل و نسب کے تفاخر کا مسلمانوں میں ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔ جبکہ آپ نے فرمایا۔ لیس للعربی فضل علے العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم وآدم من التراب (عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے)

اقبال نے اسلام کے رنگ و نسل و قوم سے بالاتر ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ وطنیت کے جذبہ کو جو ایک انسان اور دوسرے انسان میں مصنوعی فرق قائم کرتا ہے۔ بت پرستی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی فکر بت گری اور بت پرستی کی ایسی خوگر رہی ہے۔ کہ جب تک ایک بت ٹوٹ جاتا ہے وہ دوسرا نیا بت تراش لیتی ہے۔ نت نئے بت تراشنے کا سلسلہ قدیم زمانے کی طرح آج بھی جاری ہے۔ ان بتوں کی چاہے شکلیں کچھ تھوڑی بہت بدل گئی ہوں۔ ورنہ ان میں کوئی بڑا فرق نہیں آج انسانی گروہوں نے وطنیت کا نیا بت تراشا ہے۔ جس کے آگے وہ سربسجود ہیں۔ اس بت پر بالکل تال انسانیت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح دوسرے بت توڑے گئے ضرور ہے کہ اس بت کو بھی توڑا جائے۔ تاکہ انسانیت کی گلو خلاصی ہو۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کابداز خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ است ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند پیش پائے ایں بت نا ارجمند

اے کہ خوردستی زمینائے خلیلؑ　　گرمیٔ خونت زمینائے خلیلؑ
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن　　تیغ لا موجود الا ہو بزن

اسلام کی قدیم روایات ہمیشہ وسیع تر انسانیت کے حقوق کی علمبردار ہیں نہ کہ مخصوص گروہوں کے عارضی معاشی مفاد کی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے آپ کے خاندان کی نسبت جب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا تھا "سلمان ابن اسلام"۔ یہ جواب ایک شخص کا جواب نہیں بلکہ ایک تہذیب کا جواب ہے جو اس نے زندگی کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے دیا تھا۔ اقبال نے اسی واقعہ کو اپنے اس شعر میں نقل کیا ہے۔

فارغ از باب دام و اعمام باش　　ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

جس طرح اسلام نے خاندانی شرف کو معدوم کر دیا اسی طرح اس نے آب و گل کی فضیلت کو بھی جس سے وطنیت عبارت ہے اپنے نظامِ اخلاق میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کا جس سرزمین سے تعلق ہوتا ہے اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز اسے بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ انسانی روح خاک کی پستیوں میں اپنے تئیں ایسی آلودہ کرے کہ اس کی قوت پرواز جاتی رہے۔ ہندی، ایرانی اور تورانی کے اعتبارات سے بالاتر ملت اسلامی کی روحانی ہستی ہے۔ جو کسی خطۂ زمین میں مقید نہیں ہو سکتی۔

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

دوسری جگہ کہا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی　　خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

ہندی اور تورانی ہونے سے پیشتر آدمی آدمی ہوتا ہے۔ اس کی آدمیت کسی خطہ سے وابستہ ہونے سے پہلے ہی وجود میں آتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں پہلے تو آدم بے رنگ و بو ہوں۔ اس کے بعد جو چاہو نام رکھ لو

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی　　تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم　　ازاں پس ہندی و تورانیم من

اقبال وطن دوست ہے لیکن وطنیت سے بیزار ہے۔ وہ اس کو اسلام کی عالمگیر روح کے منافی تصور کرتا ہے اس مسئلہ پر اس نے مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں تفصیل سے وطنیت کے فلسفہ پر بحث کی تھی۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہستیوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے۔ تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے۔ کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار دیا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ ہے۔ جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی۔ کہ دین پرائیوٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ "دین" نہ قومی ہے، نہ نسلی۔ نہ انفرادی اور نہ پرائیوٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا "دستورالعمل" قوم و نسل پر بنایا نہیں جا سکتا۔ نہ اس کو پرائیوٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک "امت" کی تشکیل اور اس کے بقا کیلئے ضروری ہے۔

کیا خوب کہا ہے مولانا رومؔ نے۔

ہم ولی از ہم زبانی بہتر است

قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصّہ میں بود و باش رکھتے ہیں۔ جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے..... مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے۔ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب لفظِ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے"

اقبال کے بعض اشعار سے ناواقف لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ وہ فلسفۂ شاہیں کو کھلم کھلا سراہتا ہے اس لئے اس کے نزدیک قوی اقوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کمزوروں کو اپنا غلام بنائیں لیکن شاید اقبال کے بعض اشعار سے یہ غلط نتیجہ اس لئے نکالا گیا کہ وہ بے عملی اور کمزوری کو انسان کی سب سے بڑی لعنت خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مظلوم بھی ایک طرح کا ظالم ہے کہ وہ دوسروں کو ظلم کرنے کا موقع دیتا ہے در اصل اس کی دلی تمنا یہ ہے کہ کمزور جماعتیں اپنی نکوکاری اور سعی پیہم سے زبردست بن جائیں تاکہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" اور دوسرے کلام میں کمزوروں کو طاقتور بننے کا طریقہ بتایا جائے۔ لیکن وہ اس طاقت کو مطلق اور بے قید نہیں دیکھنا چاہتا انسانیت اور اخلاق کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔

اقبال لوکیت یا امپیریل ازم کو جارحانہ وطنیت ہی کا ایک شاخسانہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم کی ضد خیال کرتا ہے۔ قومیت کے علمبرداروں کا نظریہ "میرا وطن غلط ہو یا صحیح" حق ہے۔ یہ جھوٹی عصبیت حق و باطل میں تمیز نہیں ہونے دیتی۔ جب آدمی سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ سب کچھ

کرسکتا ہے۔ اور اپنے عمل کو حق بجانب ٹھہرا سکتا ہے۔ جدید مملکت اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کے لئے نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس طرح ملوکیت جو وطنیت ہی کی ایک شکل ہے۔ نئے نئے علاقوں کو فتح کرکے اپنا پھریرا اڑانا چاہتی ہے اور اپنے اقتدار کے حدود دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع کرنے کی متمنی رہتی ہے۔ اس کو اپنا اقتدار وسیع کرنے سے کام، چاہے خدا کی بے بس مخلوق پر کچھ بھی گذرے۔ آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء سال نو کے موقع پر اقبال نے جو پیغام دیا تھا اس کا ایک ایک لفظ انسانیت دوستی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے اس پیغام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوت کے استعمال کو صرف اسی وقت جائز سمجھتا ہے جبکہ وہ اخلاقی مقاصد کے لئے ہو نہ کہ جوع الارض کیلئے اس پیغام کے الفاظ یہ ہیں۔

"دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے۔ اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے آج زماں و مکاں کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں۔ اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں غدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کرسکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی ہے۔ وہ خونریزی، سفاکی اور زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسانوں کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا، صرف اس واسطے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچایا جائے"۔

"انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرکے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشری روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں

کو خونریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔ جو سال گزر چکا ہے اسکو دیکھو اور نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہو کہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو طاقتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا یہی انجام ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسئلوں کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائیگا، جب تک جغرافی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔ اور اخوت حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہونگے۔"

اپنی شاعری اور فکر کے ابتدائی دور میں اقبال نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کے مسئلہ پر غور کیا تھا۔ اور اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کا بھی اسی طرح سے وطن ہے جس طرح ہم

کے دوسرے بسنے والوں کا مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں اس ملک کو اپنا وطن بنایا اور یہیں رس بس گئے۔ انھوں نے اس کی حفاظت میں چھ صدیوں تک اپنا خون بہایا اور بعض اوقات خود اپنے ہم مذہبوں سے ہندوستان کی خاطر جنگ کی۔ چنانچہ اقبال کی اس زمانہ کی بعض نظمیں وطن پرستی[1] کے جذبات سے مملو ہیں اور اردو ادب میں اب تک اپنی نظیر آپ ہیں۔ ترانہ ہندی، نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت اسی رنگ میں ہیں۔

اقبال کو ہر اعلیٰ جذبات رکھنے والے شخص کی طرح وطن سے محبت ہے۔ لیکن وہ وطنیت سے بیزار ہے جو ایک مستقل نظریۂ حیات ہے جس کی تبلیغ سب سے پہلے مغربی دنیا میں مخصوص اغراض کے تحت ہوئی بدقسمتی سے ہندوستان کے نام نہاد وطن پرستوں نے بھی اہلِ مغرب کی ریس میں ہندوستان کی ہیئتِ اجتماعیہ کے نشوونما کے لئے انھیں اصولِ حیات کو اختیار کرنا ضروری سمجھا جو یورپ میں جنگ و فساد کا موجب ثابت ہوئے ہیں۔ اور جو اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔ مغربی تصورات کے تحت اس ملک کی اکثریت نے ہندوستان کی ہیئتِ اجتماعیہ کی تنظیم کے لئے جو نقطۂ نظر اختیار کیا وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی روایات کے نقیض تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس سے مسلمانوں کی باطنی ہم رنگی اور اشتراک احساس کو سخت صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا چنانچہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس (الہ آباد) میں اقبال نے ہندوستان کی متحدہ قومیت اور اس ملک کے مشترک مفاد کے متعلق جو اظہار خیال کیا وہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خطبہ میں اقبال نے بتایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پورا حق حاصل ہے۔ کہ وہ ان علاقوں میں جہاں انھیں اکثریت حاصل ہے اس قابل ہوں کہ اپنی تہذیب روایات کو آزادی کے ساتھ ترقی دے سکیں۔ اس غرض کیلئے ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فرنگی جمہوریت کے اصول اس ملک کے مخصوص حالات کیلئے موزوں نہیں ہیں۔ اقبال نے اسلامی ہند کی سیاسی تشکیل کے تصورات کو سب سے پہلے اس موقع پر پیش کیا۔ جس کی رو سے پنجاب، صوبہ سرحدی، سندھ اور

---

[1] اس جذبہ کو وطن پرستی کے بجائے وطن دوستی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ وطن پرستی سے دہن وطنیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جو اقبال کے نزدیک بدترین لعنت ہے۔ (طلوع اسلام)

بلوچستان کو ملا کر ایک علیحدہ مملکت قائم کی جائے جسکو حکومت خود اختیاری کے تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں، چاہے سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر یا اس کے باہر۔ اقبال نے اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں ہندوستان سے سچی محبت پیدا ہوگی اور وہ اس کی آزادی کے لئے اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے

اقبال جدید مملکت کی جمہوری تنظیم کو ہر ملک کیلئے موزوں نہیں سمجھتا۔ یہی جمہوریت جو کمزور قوموں کے حقوق کی علمبردار بن کر اٹھی تھی آج ملوکیت کے پست ترین مناظر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ فرانسیسی جمہوریت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب کے وقت "قوم زندہ باد" کا جو نعرہ بے بس مخلوق کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کیلئے بلند کیا گیا تھا وہی بعد میں جمہوری فرانس کی سلطنت کو وسیع کرنے اور دوسروں کو غلام بنانے کیلئے استعمال کیا گیا۔ قوت و اقتدار کا جذبہ جدید تمدن دنیا کا سب سے زیادہ موثر جذبہ ہے۔ جس کا شکار خود جمہوریتیں بن گئیں۔ پھر موجودہ جمہوریت کے خارجی مظاہر ایسے پھسپھسے زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنیوالے اور غیر مستحق لوگوں کو سیاسی اقتدار کی گدی پر بٹھانیوالے ہیں کہ اگر اقبال بھی اس دور کے دوسرے نامور مفکروں کی طرح ان سے بیزار ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ عمومیت کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کی بدولت انسانی ذمہ داری کے اصول کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔ اس نظام کے تحت وہ لوگ کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔ جو ایسا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں بلکہ عوام پر اپنی رائے کی تشکیل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بھی خود کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے تئیں خارجی قوتوں کا کھیل تصور کرتا ہے زمانہ کی آندھیاں اسے کبھی ایک طرف اڑا لے جاتی ہیں اور کبھی دوسری طرف اپنے اخلاقی معیار سے حالات اور واقعات کو جانچنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے فیصلہ کو بھی دوسری کی رائے کا پابند کر دیتا ہے اس کا نہ کوئی سیاسی عقیدہ ہوتا ہے اور نہ کوئی عمرانی نصب العین جس کی روشنی میں وہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ زندگی اس کے لئے ایک بھول بھلیاں ہے جس میں وہ ایک اندھے آدمی کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔ جب کوئی واضح منزل اس کے سامنے نہیں تو ظاہر ہے

کو اسکو آگے بڑھنے اور حالات بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہی حالات ہیں جنکے باعث جدید عمومی مکاتیب حرکت اور عمل کے لئے اخلاقی اور روحانی محرکات کی متلاشی ہیں کہ بغیر ان کے ان کا وجود خطرہ میں ہے۔ انسانیت کے تمام اہم فیصلوں کو جو زندگی کے رُخ کو بدلنے والے ہوں محض تعداد کے تابع کر دینا انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ جمہوریت کا بڑا عیب جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ وہ شمار کرنا تو جانتی ہے۔ لیکن وزن کرنا نہیں جانتی۔ جس کے بغیر ہیئتِ اجتماعی میں عدل و اعتدال قائم نہیں رہ سکتا۔ اقبال نے جدید جمہوریت پر متعدد جگہ اپنے مخصوص انداز میں تنقید کی ہے یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی — زموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

دوسری جگہ کہا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جسکے پردہ میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ دارونکی ہے جنگِ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال حقیقی آزادی کی روح کا مخالف نہیں۔ آزادی خودی کی پرورش کیلئے ضروری ہے۔ غلامی کی بے آب و رنگ زندگی انسانیت کیلئے باعثِ ننگ ہے۔ وہ خود آزاد منش شخص تھا اور دوسروں میں بھی آزادی کا جوہر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو اس امر کا قوی احساس تھا کہ افراد میں اعلیٰ سیرت و کردار صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوں۔ اس کو غلاموں کی بصیرت میں ہمیشہ شبہ رہا۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

اقبال نے اپنے آخری زمانے کے کلام میں بھی ہندوستان سے اپنی محبت اور اس کی آزادی کے متعلق اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ محبت اس فطری جذبہ پر مبنی ہے جو انسانیت کی قدر مشترک ہے۔ یہ محبت اس واسطے نہیں کہ دوسروں سے نفرت کی جائے۔ اپنی نظم "شعاعِ امید" میں وہ مشرق کی عام بدحالی اور تاریکی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی "شوخ کرن" سے اُسی طرح اپنی امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کیلئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب!
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب!
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب!
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

پھر اہل ہند سے یوں گلہ کرتا ہے۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

"جاوید نامہ" میں اقبال نے مختلف افلاک کی سیر کا حال بیان کیا ہے جو اس نے اپنے مرشد مولانا روم کے ساتھ کی تھی۔ فلک زحل پر "روحِ ہندوستان" سے اقبال کی ملاقات ہوئی۔ چنانچہ وہ اس ملاقات کا ایسے درد بھرے لفظوں میں ذکر کرتا ہے کہ اس کا ہر لفظ دل کے

پار ہو جاتا ہے[1] "روحِ ہندوستاں" سے ملاقات کا پہلا منظر یہ ہے۔

آسماں شق گشت حورے پاک زاد ۔۔۔ پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال ۔۔۔ در دو چشم او سرورِ لایزال
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند ۔۔۔ برلبِ او نالہ ہائے دردمند
گفت رومی روحِ ہند است ایں نگر
از فغانش سوز ہا اندر جگر

ہمارے شاعر کو دیکھ کر "روحِ ہندوستاں" اس کی طرف بڑھی اور اس طرح نالہ و فغاں کرنے لگی:۔

شمعِ جاں افسردہ در فانوسِ ہند ۔۔۔ ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکے نامحرم از اسرارِ خویش ۔۔۔ زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش
بر زماں رفتہ می بندد نظر ۔۔۔ زآتشِ افسردہ می سوزد جگر
بند ہا بر دست و پائے من ازوست ۔۔۔ نالہ ہائے نارسائے من ازوست

اس سیر کے سلسلے میں اقبال اور پیر رومی ایک خونیں دریا کے پاس پہونچے۔ جس میں ایک کشتی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی ادھر سے اُدھر جارہی تھی۔ اس کشتی میں سے آواز آئی کہ ہمیں نہ "وجود" قبول کرتا ہے اور نہ "عدم"۔ ہم کہاں جائیں؟ ہم نے جہانِ شرق و غرب کی خاک چھان ڈالی، کہیں ہمارے لئے جائے پناہ نہیں۔ جہنم کی منتیں کیں کہ اپنے دروازے کھولدے۔ ہم اندر داخل ہوجائیں۔ لیکن اس نے بھی ہم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مرگِ ناگہاں کے پاؤں جوڑے کہ خدارا ہمیں نجات دے، اس نے پہلے ہمیں دیکھا اور آنکھیں پھیر لیں۔ یہ دونوں رُوحیں بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کی تھیں جنھوں نے اپنے وطن

---

[1] اس لئے کہ حضرت علامہ اقبالؒ اس خطۂ ملک سے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ابتدا کرنا چاہتے تھے اور یہیں سے اس چشمۂ کوثر کی مختلف شاخیں گردوپیش کے خطوں میں پھیلانے کے متمنی تھے۔ "طلوعِ اسلام"

سے غداری کی تھی۔[1]

جعفر از بنگال و صادق از دکن ۔ ننگ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد ۔ ملتے از کارِ شاں اندر فساد

اسی ضمن میں اقبال ملت ہندی کا درد بھرے دل سے ذکر کرتا ہے اس کا ہر لفظ حب وطن کے جذبات سے بھرا ہوا ہے وہ اس کی زبوں حالی پر اس طرح نوحہ کرتا ہے۔

ملتے کو بند ہر ملت کشاد ۔ ملک و دینش از مقام خود فتاد
می ندانی خطۂ ہندوستاں ۔ آں عزیز خاطر صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز ۔ درمیان خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخم غلامی را کہ کشت ؟ ۔ ایں ہمہ کردار آں ارواح زشت

ہندوستان اب تک گو خلاصی کی جد و جہد میں اس لئے ناکام رہا کہ اس کی حیات اجتماعی میں جعفر و صادق کی ملعون روحیں اب تک اپنا کام کر رہی ہیں۔ ان ارواح زشت کی لعنت سے اس ملک کے افراد میں اعلےٰ سیرت کا جوہر نہیں پیدا ہوا۔ جسکی بدولت وہ اپنی کوتاہ خیالیوں کو مصالح کلی کی خاطر قربان کرتے اور اپنے مسائل کے حل میں عقل و بصیرت سے کام لیتے۔ انہیں کی وجہ سے وہ غالب قوم کی جادوگری سے مسحور ہیں۔ جب وہ ذرا خواب کی حالت سے بیدار ہوتے ہیں تو حکمرانوں کی ساحری پھر انہیں تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مسحور ہونے والوں نے ابھی تک رد سحر کا پکا ارادہ نہیں کیا۔ اس باب میں کسی دوسرے کی شکایت فضول ہے۔ شکایت کرنا ہے تو خود اپنے آپ سے کرنی چاہئے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ملوکیت اور غلامی کی نفسیات کس خوبی سے بیان کی ہے۔

---

[1] اس لئے نہیں کہ ان کی غداری سے ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکل کر غیر ہندیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ بلکہ اس لیے کہ انکی اس غداری سے صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات ختم ہو گئے۔ حکومت ہندیوں کی ہو یا غیر ہندیوں کی۔ اقبالؒ کے نزدیک دونوں ناقابلِ قبول ہیں وہ صرف خدا کی حکومت کے قائل ہیں" طلوعِ اسلام"

میں بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اسکو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن — تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

معروضہ بالا مطالب سے واضح ہوگیا ہوگا کہ اقبال اجتماعی زندگی کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت کا تو قائل ہے. لیکن اس کی کسی مخصوص خارجی شکل کو مطلق اور دائمی نہیں سمجھتا۔ ہر قسم کا طرزِ حکومت صحیح اور موزوں ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کے اعمال انسانی نتیجہ خیز بننے ہوں۔ اور نظامِ عدل نافذ ہوتا ہو. جو اس کی وجہ وجود ہے۔ اگر حکومت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی، تو وہ بے سود ہے۔ چاہے اس کی اصطلاحیں کتنی ہی مرعوب کن کیوں نہ ہوں۔ اس خیال کے علاوہ اس کے سیاسی افکار میں قدرِ حریت کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ انسانی رُوح کی آزادی کا علمبردار ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ ہر گروہ کی خود مختاری[1] کا قائل ہو۔ جدید مملکت کی خصوصیات کے متعلق اس نے اپنے مخصوص انداز میں تنقید کی ہے۔ وہ اس کی جارحانہ وطنیت اور ملوکیت، اخلاق سے اس کی بے تعلقی اور اس کے جھوٹے جمہوریت کے دعوؤں سے بیزار ہے وہ دنیا میں ایسا نظامِ حکومت دیکھنے کا متمنی ہے جو وسیع تر انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہونے کے بجائے ممد و معاون ہو۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہے۔ جب کہ سیاست بھی تمدن کے دوسرے شعبوں کی طرح بے قید اور مطلق العنان نہ رہے۔ بلکہ منضبط د آئین[2] اور اخلاق کی پابند ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک وہی سیاست حقیقی ہے جو مصالحِ کلی کی نگہبان ہو نہ کہ جزئی مفاد کی جسے افرادی نقطۂ نظر کے مطابق اکثریت کے ذریعے متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ سیاسی نظام دائمی نوعیت نہیں رکھتا۔ اس لئے

---

[1] اُنھی حدود کے اندر جو قرآن کریم نے متعین کی ہیں (طلوعِ اسلام)

[2] یعنی آئینِ خداوندی کی (طلوعِ اسلام)

انسانیت کو اس کا پورا موقع حاصل رہتا ہے۔ کہ وہ نئے حالات کے مطابق ازلی و ابدی، اخلاقی اصولوں کے تحت اپنی معنوی تنظیم عمل میں لاتی رہے۔ اور اپنے احوال و ضروریات کی تکمیل کا سامان بہم پہونچایا جائے۔ ضرور ہے کہ اس تنظیم میں انفرادی اقدار جیسے آزادی، عزتِ نفس اور ذاتی وقار برقرار رہیں اور ساتھ ہی ہیئتِ اجتماعی کی مجموعی نشو و نما اور نظام امن عدل میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ سوائے اس صورت کے مملکت اپنے منشا کو پورا نہیں کرسکتی۔

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ

اگرچہ قالبت خاکی نہاد ست
بنا کن بر ثریا مسکنِ خویش
نگاہے بر رموزِ "فَاذْکُرُوْنِیْ"
برآر از طوقِ شیطاں گردنِ خویش

کلیم سینائی

بسلسلۂ اصلاح

عقیدہ و عمل

(از مولانا مشتاق احمد صاحب افغانی، فاضل دیوبند، مولوی فاضل لیہ)

طلوع اسلام کے متعلق ابتداء سے ہی ایک شکایت عام طور پر سامنے آتی رہی ہے یعنی ایک طبقہ کو گلہ ہے کہ اس کے مضامین اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ عوام ان سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ یہ گلہ اپنی جگہ پر درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اولین مخاطب طبقہ ہی تعلیم یافتہ نوجوان ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ طلوع اسلام کو اللہ تعالیٰ نے جس قبولیت عامہ سے نوازا ہے اس کی وجہ سے اس کے قارئین میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو قلب و نظر کے اعتبار سے بہت بلند ہے لیکن تعلیم کے اعتبار سے اتنا بلند نہیں۔ ہم پر اس طبقہ کا حق ہو چکا ہے کہ ان کی سمجھ کے مطابق بھی مضامین شائع کئے جائیں جس اتفاق کہ اس کے ساتھ ہی ہمارا تعارف ایک ایسے عالم دین سے ہو گیا جنہیں ایک طرف صحیح قرآنی بصیرت اور دل درد آشنا عطا ہوا ہے اور دوسری طرف ان کی زندگی اور اس کی تمام مساعی کا حلقۂ اثر عوام کا طبقہ ہے۔ ملتان مظفر گڑھ ڈیرہ غازی خاں۔ وغیرہ اضلاع کی عجیب کیفیت ہے یہی وہ خطہ تھا جہاں اسلام کے جھنڈے سب سے پہلے نصب ہوئے۔ اور آج بھی وہ خطہ ہے جہاں بالعموم جہالت اپنا گھر کئے ہوئے ہے۔ مولانا مشتاق احمد صاحب نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی اپنے علاقہ کو اصلاح و ارشاد کے لئے منتخب فرمایا اور دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود وہاں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم کر دیا ظاہر ہے کہ عوام کے مسائل سے متعلق ان سے بڑھ کر اور کسی کی نگاہ دور رس ہو گی۔ ان کے مضامین میں یہ خوبی ہے کہ ان کا انداز بیان تو ایسا ہے جس سے عوام مستفید ہو سکیں لیکن اگر خواص بھی بنگاہ تعمق دیکھیں تو محسوس کریں کہ یہ تو ہماری ہی داستان دہرائی جاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ

مولانا صاحب ایمان کے حلقہ اثر امکا یہ سلسلہ مضامین عوام کی اصلاح کے اس مقصد کو کما حقہ پورا کریگا جو ہمارے پیش نظر ہے ۔ طلوع اسلام }

سابقہ اقوام قوموں کے عروج و زوال کی داستان اپنے اندر جو حقائق رکھتی ہے ۔ کہ قومیں کس طرح بلند ہو کر انسانی معراج حاصل کرتی ہیں ؟ اور کس طرح پست ہو کر ذلت کے گڑھے میں جھونک دیکاتی ہے ۔ قرآن کریم اس پر شاہد عدل ہے ۔

قوم شعیبؑ قوم نوحؑ ، قوم صالحؑ ، قوم ہودؑ ، قوم لوطؑ ، اور قوم ابراہیمؑ وغیرہ اقوام کا کچا چٹھا ، ابھرنا اور گرنا ، عروج اور زوال قرآن کریم میں مفصل درج ہے ۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ عقلمندوں کے لئے ان اقوام کی زندگی اور موت آبادی و بربادی ، اور بلندی و پستی میں عبرت کے سبق اور نشانیاں ہیں ۔

عہد حاضرہ کی اقوام میں آج بدھ ، ہندو ، عیسائی ، یہودی اور مسلمان بڑی قومیں نظر آتی ہیں ہر ایک قوم ظاہری رسوم کی پابندی میں ایک دوسری سے زیادہ مضبوط ہے ، اور ایمان اور مذہب کو صرف ظاہری رسوم کی پابندی میں مضمر اور ان کی خلاف ورزی کو مذہب سے بُعد سمجھتی ہے ۔ اصول مذہب سے خواہ کوسوں دور کیوں نہ ہو اس کا انہیں قطعاً احساس نہیں ہوتا ۔

بدھ مت بدھ مت کا تمام زور صرف الفاظ کو زبان سے رٹنے بلکہ چرخے پر حرکت دینے اور کئی کئی بار گھمانے پر ہے ۔ جناب بدھ جو اپنے زمانہ میں اپنے وقت یا خاص علاقہ کے لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلانے آئے تھے ۔ اگر اس بات کو مان لیں کہ وہ درحقیقت ایک رشی اور پیغمبر تھے ۔ بعد ازاں بدھ سے بت بن گئے (بدھ بمعنی بت ۔ قابل پرستش) مذہب کی اصلی تعلیم تو رخصت ہو گئی ۔ صرف ایک بت کی پوجا مذہب بن گیا ۔ جا بجا جاتا بدھ کے بت دکھائی دیتے ہیں ۔

ہندو مت ہندو کا تو کچھ نہ پوچھئے صرف سر کی چوٹی (وہ بھی کہیں کہیں غیر ضروری ہو رہی ہے) ختنہ نہ کرانا اور دھوتی کی ایک خاص شکل کا نام ہندو مت رہ گیا ہے (ورنہ اگر گوشت خور بھی ہندو ہے اور گوشت کا تارک بھی ۔ مردہ خور بھی ہندو ہے اور مردہ سے نفرت کرنے والا بھی ہندو گائے کا پوجاری بھی ہندو ہے

والا بھی ۔ سازوسامان کو گھر میں زینت دینے والا بھی ۔
اور گائے کے چمڑے کے جوتے بنانے والا، پہننے والا اور چمڑے کے
بتوں کا پجاری بھی ہندو ہے ۔ اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو کروڑوں دیوی دیوتاؤں کا پرستار بھی ہندو ہے
اور صرف اقانیم ثلاثہ کو خدا ماننے والا بھی ہندو ۔

عیسائیت

عیسائی نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو بالکل بھلا رکھا ہے ۔ اس کے نزدیک مذہب یہ ہے کہ
آپ کی صلیب کی شکل بنا کر اسی کی پرستش کی جائے اور حضرتؑ کے سولی چڑھانے کو اپنے
اعمال کے لئے کفارہ سمجھے اس کے ہاں عمل کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اپنے اغراض اور اپنی من مانی مرادیں دل کھول کر
پوری کر لیجاتی ہیں ۔ شراب پر بندش نہیں بداعمالی پر کوئی پہرہ نہیں بلکہ بداعمالی بداعمالی ہی نہیں ہے ۔

یہود

یہودیوں کا تو اقوام میں نام ہی نہ لیجئے ۔ کوئی زندہ اقوام میں اس کا شمار تھوڑا ہے ؟ یہ قوم تو جیتے جی مر گئی
ایسی گری کہ ابھرنے کا نام تک نہ لیا ۔ ذلت (غلامی) اور مسکنت (بے حسی بے عملی) ان پر مسلط کر دی گئی ۔
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۔ الآیۃ ۔ اور خدا تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو گئی ۔ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ ۔ الآیۃ اور اس طرح خدا تعالیٰ کی زمین اس پر تنگ ہو گئی کہیں چپہ بھر زمین نہیں ہے جس میں ٹھنڈی
سانس لے سکیں ۔ ہر جگہ سے دیس نکالا ملتا ہے ۔ یہ تو تھا دیگر اقوام کا اجمالی سا نقشہ ۔

مسلم قوم

اب مسلم قوم کی حالت ذرا تفصیل سے ملاحظہ کیجئے کہئے اور دیکھئے کہ ہماری خانقاہیں اور
مقابر اولیاء اور بزرگوں سے پر ہیں ۔ ہر سفید، چونے گچ اور پختہ قبر یا چار دیواری میں محدود،
غلاف سے ڈھکی ہوئی قبر خواہ کچی ہو ۔ ولی اللہ کی قبر سمجھی جاتی ہے، جہاں کا ہر ایک متولی سجادہ نشین اور صاحب بیعت
بزرگ ہے ۔

ہماری مساجد مولویوں اور حافظوں سے پر ہیں، جہاں تفسیر حدیث، فقہ، منطق، کلام، صرف، نحو اور فصاحت
و بلاغت کے درس دئے جاتے ہیں ۔ یا قرآن کریم کو مخارج سے حفظاً یا ناظرہ تلاوت کرایا جانا مقصود ہے ۔
شہروں اور دیہات میں کہیں کہیں امراء اور صاحب دولت حضرات کا وجود بھی نظر آتا ہے جو کئی ایکڑ اراضی
کے مالک ہیں ۔
مگر اس تمام ولایت، پیری مریدی، درس و تدریس اور ملائیت، حفظ قرآن یا ناظرہ خوانی سے ٹھوس

اسلامی عمل یا اسلامی خدمت قطعاً مراد و مقصود نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں غور و تدبر کرنے، اور اسوہ حسنہ کی اتباع اور تقلید کرنے، صحابہؓ اور ائمہ دین کی طرح حق کی راہ میں جہاد کرنے، اور حق کی راہ میں کٹ مرنے اور اعمال صالح پیدا کرنے کی بجائے۔

خودغرضی

خودغرضیوں اور برائیوں، نہیں نہیں قوم کے اندر گندگی اور سڑاس کے گھروندے بنانے میں اس قدر منہمک ہو گئے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کو بھی ان قومی رہبروں میں کوئی شہید التکوناً شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ الآیۃ، حق کی شہادت دینے والا، حق پر کٹ کر اپنے خون سے حق کی صداقت ثابت کرنے والا نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ عیاری اور مکاری کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ مرحوم (ذرا ترمیم کے ساتھ) ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ مُلّائی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری!

غلامی

خودغرضی اور غلامی لازم و ملزوم ہیں۔ صدیوں کی غلامی نے ہماری رہی سہی عقل پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ حق و باطل کی تمیز، سچ جھوٹ میں فرق اور درستی نادرستی میں امتیاز کی قوت مفقود ہو چکی ہے۔ حکومت اپنی نہیں کہ مسلمان سے اس کا بھاؤ پوچھے۔ بلکہ اس بے راہ روی میں حکومت اپنا فائدہ سمجھتی ہے۔ غلام جتنا بے راہ رو ہے آقا کی مسرت اور خوشی کا اس میں اتنا ہی سامان پوشیدہ ہے۔ غلاموں میں رہ کر صرف غریبوں کا طبقہ ہے جو کچھ احساس رکھتا ہے مگر بوجہ غریبی مفلسی ان کی سنتا کون ہے۔ عربی میں ایک شعر ہے کہ:۔

ان الفقیر اذا تکلم صادقاً قالوا کذبت وابطلوا ما قالا

فقیر اور مفلس جب سچی باتیں کہتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ "تو جھوٹا ہے" اور اس کی سچی باتوں کو باطل قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور غلام زردار طبقہ (سرمایہ پرست خواہ امیر ہے خواہ مُلا خواہ پیر) غریبوں کی گھات میں رہ کر ان کا شکار کرتا ہے۔ ان کو اپنے مفلس اور تنگدست (مظلوم) بھائیوں کی کیا پڑی کہ ان کو شاہبازی کی تعلیم دیں وہ (سرمایہ دار) ان کو ضعیف تر کرنے میں کوشاں رہتے اور اس ابلہ فریبی کو مکارانہ دلائل سے مضبوط کر کے اپنی من مانی مرادیں پوری کرتے رہتے ہیں۔ اور بظاہر دو سو سال کے رسوم و رواجات کو مذہب کی شکل دے کر غریب کو

نمٹتے ہیں۔

گناہ اور بد عملی

اس ایک مقصد گناہ اور بدعملی کو ہانی دینے کے لئے سب شکار مسلمان (مزدور) اور صیاد مسلمان (سرمایہ دار) ظالم اور مظلوم دونوں ایک مشترک راہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اسی راہ کو جس میں مظلوم کو خاموش کر دیا جاتا ہے اور ظالم کے ظلم کی تمنا اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ مذہب کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اور اسی پر نجات ہے۔ اور یہی مذہب ہے جس پر عالم اور مولوی۔ پیر، اور امیر کی زندگی کا مدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آیۂ کریمہ میں ان سب کی یوں خبر لی ہے :۔ (اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ) بہت سے مولویوں اور تارک الدنیا گوشہ نشینوں میں سے ایسے ہیں کہ (لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ) کھاتے ہیں لوگوں کے مال باطل اور ناحق سے (وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) اور روکتے ہیں لوگوں کو اللہ کی راہ سے (وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ ثُمَّ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) اور وہ (زردار) لوگ جو جمع رکھتے اور دفن کرتے ہیں سونا اور چاندی اور پھر ان کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں (فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ) پس ان سب لوگوں (حکام، علماء، تارک الدنیا درویشوں یا پیروں اور امراء) کو المناک عذاب کی بشارت دے دو۔

گناہ کے ساتھ دعویٰ اصلاح

چونکہ ہر گروہ میں سے اکثریت گناہوں اور برائیوں کے سایہ میں پلی اور پل کر جوان ہوئی اس لئے گناہ اب مسلمانوں کی جائداد بن گیا ہے۔ ہر وقت اپنے کو صاحب جائداد قرار دینے کے لئے "گناہگار" کے لفظ سے اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس گناہگار کے لفظ سے اپنی عاجزی کا تصور بھی مطلوب ہوتا ہے۔ حالانکہ گناہ ایک فساد ہے "اِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں۔ یعنی گناہ نہ کرو اور گناہگار نہ بنو بلکہ نیکی کرو اور نیکی پھیلاؤ۔ اور گناہ کو روکو۔ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" تو کہتے کہ ہم ہی تو مصلح ہیں، گویا اس گناہ کی اشاعت یا گناہگاری کے اظہار میں ہی اصلاح سمجھی جاتی ہے مگر بارشادِ خداوندی "اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ" سنو سنو کہ یہی مفسد ہیں "وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ" لیکن انہیں شعور ہی نہیں یعنی ایسے بے شعور واقع ہوئے ہیں کہ کوئی شعور کی بات ان میں نظر نہیں آتی۔

گناہ کا پروگرام گناہ اور بدعملی کے جاندار بن جانے کے بعد ضرورت معلوم کی گئی کہ اس کا کوئی منظم پروگرام بھی قوم کے سامنے پیش کیا جائے جس سے تمام قوم افیون خوردہ ہوجائے اور ان کی خودغرضیاں پوری ہوجائیں۔ (وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ الآیۃ)

تقدیر اس نے کہیں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جو کچھ کوئی عملی طور پر کرتا ہے یا کہتا ہے وہ اس کی تقدیر کا لکھا ہے جو امٹ ہے اور جُفَّ القلم (قلم خشک ہوگیا ہے) زیادہ اور کم اسے کچھ اختیار ہی نہیں، اس لئے بُرے آدمی کا اچھا بننا یا اچھے کا برا بننا یا کسی تبدیلی کی کوشش کرنا تقدیر سے مقابلہ کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ؎

رباعی

اے بعلم ازل مرا دیدی	دیدی اگر بعیب بخریدی
تو بعلم ازل و من بعیب چاں	ادمکن آنچہ خود پسندیدی

یہی رباعی لکھ کر پنجاب کے مغربی اضلاع میں ملا صاحب (میت غسال) مردہ کے بائیں ہاتھ میں دے چھوڑتے ہیں گویا مردوں کے عیب تو مصدقہ ہیں۔ مگر خدائے تعالےٰ کے اپنے منظور اور پسندیدہ ہیں۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کو ازلی علم تھا کہ فلاں شخص میں فلاں عیب ہیں اس لئے بندے کو اب تبدیل کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اور ملا صاحب مُردے کے دائیں ہاتھ میں یہ رباعی لکھ کر دیتے ہیں:۔

وفدت على الكريم بغير زاد	من الحسنات والقلب السليم
فحمل الزاد اقبح كل شئ	اذا كان الوفود على الكريم

(ترجمہ) میں کریم کے دربار میں حاضر ہوگیا مگر بغیر سامان سفر کے جو بھلائیوں اور قلب سلیم کی شکل میں چاہئے تھا پس سامان کا اٹھانا تمام چیزوں سے زیادہ قبیح ہے جب کہ کریم کے دربار میں حاضری مطلوب ہو (اگرچہ قرآن کریم علی عمل اور تزود بالتقوی کی جہرا دعلانیۃ تلقین کرتا ہے) اس تقدیر کو ماننے کی وجہ سے لوگوں کا ایمان بالعمل ضبط ہوگیا۔

رسالت اگر انسانی مساعی پیغمبر علیہم السلام کی بعثت اور الہامی کتابوں کو سامنے رکھ کر بتایا جائے کہ تقدیر انسانوں کو برائیوں پر مجبور نہیں کرتی (اور تقدیر کا مفہوم لوگوں نے غلط سمجھ لیا ہے) اور انسان اپنے اعمال میں مختار ہے کہ جزا و سزا کا مستحق ہوتا ہے تو ایک اور تجویز نکالی گئی کہ مسلمانوں کو گناہوں سے

کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود گناہوں کے شفیع ہیں یعنی شفاعت کے غلط مفہوم کی آڑ میں گناہوں کی حمایت کیجاتی ہے۔ اور اسے ایمان بالرسالت سمجھا جاتا ہے۔

ضرورت پیر اور پھر شفاعت، چونکہ آخرت میں ہوگی اور گناہگار کا ایمان متزلزل ہوتا ہے۔ منسے ہر چند شفاعت کا دم بھرتا ہے۔ بلکہ اسی کی آس اور امید میں گناہوں میں اور دلیر ہوگیا ہے۔ مگر دل میں غیر یقین بھی ہے۔ اسی لئے اُسے دنیا میں بھی ایک ضامن اور کفیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی تلاش اور انتخاب اس کی اپنی غلط اور کمزور نگاہ پر موقوف ہے۔ جس کو چاہے پیر بنالے۔ غرض پیری و مریدی کی ضرورت ہندی مسلمان کو صرف اپنی کمزوری کو تقویت اور گناہوں کے لئے سہارا کی غرض سے پیدا ہوئی ہے مرید اپنے پیر جیسا کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔ زندہ ہے تو مرید کی ہر مشکل کا حل کرنے والا ہے۔ اور مُردہ ہے تو قبر میں بھی مرید کی حاجت روائی کے لئے تیار ہے۔ اور ہر جگہ سے مریدوں کی درخواستوں کو سنتا اور دیکھتا ہے۔ برزخی زندگی میں (اگر کوئی ہے تو) اسے دنیاوی زندگی سے کامل تر اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔ اور اس خیال کو سمع موتی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ مسئلہ مسلمانوں میں بہت اہمیت حاصل کر گیا ہے کہ مُردہ کو بعد موت بھی سمع بصر وغیرہ دنیاوی حواس اسی طرح میسّر رہتے ہیں (صوفیوں کا کشف قبور بھی سمع موتی کی فرع اور نتیجہ ہے)

ازالہ غلطی بعض لوگ پیری مریدی کے سلسلے سے نیکی یا عبادت کی اشاعت چاہتے ہیں۔ مرید نیکی کا متلاشی ہے تو پیر نیکی کا مبلغ۔ مگر نیکی مجرد اور لازم نیکی ہے، متعدی نہیں۔ یعنی تمام عمر اپنے نفس کی اصلاح میں گذر جاتی ہے۔ تسبیح اور چلوں سے فراغت ہی نہیں ہوتی۔ اور ان تسبیحوں اور چلوں کو جہاد اکبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نہ نفس سے فراغت ہوگی نہ خدا تعالے کی راہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد کرنے کی ضرورت ہوگی۔

پیر کا اپنا عمل پیر چونکہ بنایا نہیں جاتا ہے اس لئے اسے خود عمل کی ضرورت نہیں۔ پیر گھرانے میں پیدا ہونا ہی کافی ہے۔ اور اگر یہ گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تو اس کے لئے صرف تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کا پیشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جس پر نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور

رنگ چمکاتا ہے۔ ہر صورت میں پیر چلتی پھرتی کونین ہے یا شربتِ بنفشہ اور عرق سونف کا مرتبان ہے یا ویزلین اور مرہم کا بہت بڑا چلنے پھرنے والا ڈپو ہے کہ مریدوں کی بیماریوں کو اپنے تھوک سے، پھونک سے اور ہاتھ سے شفا بخشتا ہے۔ اور بعد مرگ بھی اس کی قبر دار الشفا ہے، حقیقتِ منتظر لباس مجاز اختیار کئے ہوئے ہے جس پر جبین ہائے نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں۔

عمل کی تعریف

یہی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈا "عمل" بنا ہوا ہے اور یہی عمل کرنے والا عامل ہے۔ اور عامل صاحب یا اس کے معمول (مرید) کے نزدیک یہی صالح عمل یا عمل بالقرآن ہے۔ سورۃ یٰسین کو کئی دفعہ قبرستان میں بیٹھے بیٹھے پڑھنا۔ سورۃ کی زکوۃ نکالنا اور اس سے اپنی منشا کے مطابق کام لینا سورۃ کا عمل ہے۔ ع

وائے گر از پسِ امروز بود فردا ئے

پیر کے اس عمل سے صحیح عمل کی جڑ پر کلہاڑا چل گیا ہے اور مسلمان کی زندگی میں گناہ کا زہر سرایت کر رہا ہے

عقیدہ اور عمل

ایک اور چیز بھی مسلمان کو گناہ پر دلیر کئے ہوئے ہے وہ یہ کہ منہ سے کہتا ہے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں تمام رسول سچے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتابیں سچی ہیں، قرآن خدا کا کلام ہے، نیکی کے فرضی تصور کے لئے پیروں اور عالموں کا قائل بھی ہے بس ان مذکورہ باتوں کو ماننا گویا عقیدہ پختہ کر لیا ہے جس کے نتیجے میں اسے جنت ملے گی۔ رہا عمل (یعنی اللہ تعالیٰ، رسولؐ، کتاب الٰہی کے احکام کی تعمیل کرنا) سو وہ الگ شے ہے۔ ایمان کے لئے عمل ضروری نہیں ہے عمل نہ کرے اور گناہ کے ارتکاب سے ایمان میں فرق نہیں آتا۔

نتیجہ

یہی وجہ ہے کہ مولوی ہو یا پیر، امیر ہو یا فقیر، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، دن رات سے اپنے کو گناہ گار کہنے اور پھر گناہ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔

تزکیہ

جس قدر انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب کا نصب العین تزکیہ نفوس انسانی رہا ہے۔ (یُزَکِّیْکُمْ) گناہوں، منکرات اور فواحش سے لوگوں کو بچاتے رہے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا کسی پیغمبر نے کسی قوم کو تعلیم نہیں دی کہ وہ گناہ کریں۔ اور پیغمبر علیہم السلام اس کا بیڑا پار کر دیں گے۔ بلکہ

پیغمبر کی اولاد اگر تابع فرمان اور مطیع نہیں ہے تو لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ کی ضرب سے اہل نبوت سے نکال دیجاتی ہے اگر بیوی خیانت کرتی ہے تو اس کے لئے نجات نہیں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کے لئے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۔ یعنی پیغمبر خاوند بھی ہوں تو خائن بیویوں کے کام نہیں آسکتے۔ اگرچہ پیغمبرؐ کا مطیع نہیں ہے تو رشتہ نبوت اس کے لئے کوئی نجات کا باعث نہیں ہے اور تبت یدا ابی لہب کے ارشاد خداوندی کی زد میں سے ابولہب بن عبدالمطلب (عم النبی صلی اللہ) تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔

مذہب اور سیاست

ہندی مسلمان، مذہب کو سیاست سے الگ سمجھ کر۔ سیاست کو تو زبردست طاقت (یعنی حاکم وقت) کے حوالہ کر دیتا ہے۔ وہ طاقت اپنی مرضی سے دیوانی اور فوجداری کے دو مہینے قائم کر کے آئے دن نئے نئے قوانین تجویز کرتی ہے اور مسلمان اس سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی بلا سے تمام قرآن بغیر عمل رہ جائے پوست بے مغز بن جائے۔ وہ صرف الفاظ میں برکت سمجھتا ہے اور ان کی تلاوت کرتا ہے۔ اور اس سے بھی مختصر مذہب کا دائرہ بہت محدود کر دیتا ہے۔ شلاً پیدا ہوتے ہی ملانے کان میں اذان کہہ دی۔ زندگی میں کسی ملا کی اذان پر کلمہ پڑھ لیا، اور مرنے کے بعد پھر ملانے قبر پر اذان کر ڈالی (جیسا کہ پنجاب کے مغربی اضلاع میں دستور ہے) بس اسلام کی حدیں پوری ہو گئیں۔ اول آخر اذان اور درمیان میں بھی اذان۔

اب گناہ کو مذہب تو روکتا نہیں کیونکہ اس کی حکومت نہیں، اس کا اثر نہیں، پڑھتے ہیں اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا الایہ مگر چوری بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ چوری کی سزا میں قطع ید (ہاتھ کاٹنا) فوجداری قوانین سے خود مقطوع ہو گئی ہے۔ ثبوت ہونے پر خوبصورت جیلوں میں چند دن رہتا ہے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (الایہ) کی جھوم جھوم کر تلاوت ہو رہی ہے۔ پڑھنے میں کوئی خوف یا رعب طاری نہیں ہوتا۔ نہ بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے کیونکہ مائۃ جلدۃ (سو درے) کا عمل نہیں ہے۔ بلکہ جیلوں کے السنس جاری ہیں۔ اور ان کو تہذیب میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

علاج ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کا علاج ایک اور صرف ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز ہو، جو تمام مسلمانوں کو ایک مسلک اور لڑی میں منسلک کرکے ان کی حرکت اور سکون کی نگرانی کرے اور قرآن کریم ان کی زندگی کی کتاب ہو، نوجداری اور دیوانی کے دفعات قرآن کریم سے ڈھونڈے جائیں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہو۔ ان کے خلاف ہر عمل کی نگرانی اور کڑی نگرانی کی جائے، تعزیرات اور سزائیں ہوں تو قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق سرکلر احکام ہوں تو قرآن کریم اور اسوہ رسول صلی اللہ کی روشنی میں۔

پھر مسلمان از سر نو مسلمان بن سکتا ہے مسلمانوں کا کلچر، تمدن اور معاشرت قرون اولیٰ کے رنگ میں رنگا جا سکتا ہے

خلاصہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کا ہر قدم چونکہ اسلام کے خلاف پڑ رہا ہے۔ اس لئے اسے قرآنی ہدایت کے مطابق اپنا قدم سیدھا کرکے حسب ذیل صفات کو از سر نو پیدا کرنا چاہیئے۔

"مُسلم:۔ سلامتی کا ذمہ دار، دنیا کو سلامت رکھنے والا، عیوب اور برائیوں سے بچانے والا"

"مُؤمن:۔ امن اور امان کا ذمہ دار، دنیا کو امن میں رکھنے والا۔ بدامنی سے بچانے والا"

"مُصلح:۔ صلح بنانے والا، اصلاح کرنے والا، فساد کو دُور کرنے والا۔ بدامنی سے بچانے والا"

جب خود سالم نہ ہو، آمن نہ ہو، اور صالح نہ ہو، بلکہ سلامتی کا دشمن، امن کو توڑنے والا اور صالح کی بجائے حاسد اور غلام ہو، تو وہ مسلم، مومن اور مصلح کے اوصاف کا کس طرح حق دار ہو سکتا ہے؟ ۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ۝

تنقید و تبصرہ

ہم نے ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بڑی ضرورت ہے جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں اعلیٰ قسم کا اسلامی لٹریچر شایع کرے۔ اس باب میں ہم نے لاہور کے ناشر کتب شیخ محمد اشرف صاحب کا بھی ذکر کیا تھا۔ جنھوں نے اس قسم کے ادارہ کی بنیاد رکھی ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس تھوڑے سے وقت میں اس ادارہ نے انگریزی زبان میں کئی ایک کتابیں شایع کی ہیں۔ ان کتابوں کی طباعت۔ ٹائپ۔ کاغذ۔ جلد۔ گردپوش۔ غرضکہ پورا (GETUP) نہایت دیدہ زیب ہے۔ اور معنوی اعتبار سے بھی فی الجملہ عام سطح سے بلند ہیں۔ وہ ہمیشہ اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس غرض کیلئے اربابِ قلم سے ملتے بھی رہتے ہیں۔ ہم اہلِ قلم حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ ایسی کتابیں لکھنے کی طرف توجہ فرمائیں جن کے ذریعے سے صحیح اسلامی رُوح نوجوانوں کے سامنے آجائے ارباب ذوق سے گذارش کرینگے کہ وہ اس قسم کے اداروں کی حوصلہ افزائی کیا کریں۔ اور ناشرین حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ تجارت کے ساتھ ساتھ اسلامی جذبہ کو بھی ہمکنار رکھیں اور کوشش کریں کہ کتابیں واجبی منافع پر فروخت ہوا کریں۔ اس دور میں جتنی کتابیں مسلمانوں کی طرف سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی قیمتیں بالعموم زیادہ ہوتی ہیں اس کے برعکس ہندو اپنے لٹریچر کو بڑے سستے داموں پر عام کر رہا ہے۔ اسکی وجوہات گوناگوں ہیں لیکن جہانتک ناشرین حضرات کا تعلق ہے ہم اُن سے درخواست کریں گے کہ وہ "تھوڑے منافع اور زیادہ بکری" کے پُرانے اُصول کو ضرور پیشِ نظر رکھا کریں۔

ذیل کی کتابیں شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں

مجدد سرہندی کا تصور توحید (انگریزی) — اسلام ایک پیام حیات بخش ہے۔ جسمیں زندگی عبارت

ہے مسلسل جہاد۔ پیہم تگ و دو اور غیر منقطع سعی و عمل ہے۔ اس میں جو لمحہ جمود و تعطل کا گذرے۔ غیر فطری ہی۔ اس زندہ اسلام کی درخشندہ تفسیر تھا۔ وہ عہد سعادتِ مہد جسمیں مجاہدین کی برگزیدہ جماعت نے اپنے یقینِ محکم اور عمل پیہم سے خدا کی حکومت کا تختِ جلال اس زمین پر بچھایا اور انسانیت کو ان تمام طوقِ و سلاسل سے آزاد کر دیا۔ جن میں وہ صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خدا نے حکم دیا۔ اس کے رسولؐ نے تعمیل اول کا نمونہ پیش کیا اور قدوسیوں کی اس جماعت نے اُسے کرکے دکھا دیا۔ کام کرنے والی قوم کو کبھی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ کہ وہ نظری مسائل میں اُلجھے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں نظری مسائل پر بحث و تمحیص کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا ایک تابناک نصب العینِ حیات اُن کے سامنے تھا اور اس نصب العین تک پہنچنے کی دُھن ان کا سرمایۂ زندگی۔ انھیں فرصت کہاں کہ لفظی گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر وقت ضائع کریں۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لیکن یہ دورِ سعی و عمل جلد گذر گیا۔ خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی تمام لعنتیں ایک ایک کر کے قوم پر مسلط ہوتی گئیں۔ دربار پر ملوکانہ تکلفات چھا گئے۔ قلب و نظر پر عجمی تصورات غالب آ گئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فارغ البالی کے دن۔ کھانے پینے کے لئے فراواں، نہ فکرِ فردا۔ نہ غمِ دوش۔ زندگی کا نصب العین ایپقوریت (EPICURIANISM) اربابِ علم و فضل بالعموم اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں میں مصروفِ عمل ہو گئے۔ پہلے یہ تھا کہ اُدھر سے ارشاد ہوا کہ "قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی" اور ادھر سے انھوں نے اپنے عمل سے اس قال کو حال کر دکھایا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ جب اللہ کے متعلق لفظِ قال (اُسنے کہا) کا استعمال ہو تو اس قول کی ماہیئت کیا ہوتی ہی؟ جو فرشتے اس "قولِ خداوندی" کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت کیا ہوتی ہی؟ ملکۂ نبوت کسے کہتے ہیں؟ وحی کی کیفیت کیا ہی؟ وغیرذالک

ان لفظی مجاہدات" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قوم سینکڑوں فرقوں میں بٹ گئی۔ اور دوسری طرف ان سے سعی و عمل کی صحیح اسلامی روح مفقود ہو گئی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ کسی مسئلہ کا

حل دریافت کرلینا۔ سب سے بڑا جہاد ہے۔ کسی مناظرہ کے میدان میں فریقِ مخالف کو منطقی دلائل سے خاموش کر دینا سب سے گراں قدر عملِ حسنہ ہے۔ جبر و قدر کے مسائل۔ تجسیم و تنزیہ کے مسائل۔ حدوث و قدم مادہ کے مسائل۔ قرآنِ کریم کے مخلوق و قدیم ہونے کے مسائل۔ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ۔ نبوت۔ وحی۔ الہام۔ معجزات۔ ملائکہ۔ جنت۔ دوزخ۔ برزخ۔ حشر نشر غرضکہ ایمان کے ایک ایک شعبہ اور عقائد کے ایک ایک گوشہ کے متعلق لفظی مباحث و جدل کا ایسا لامتناہی سلسلہ چھڑا کہ کثرتِ تعبیر سے خواب پریشاں ہوگیا اور یوں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

ایک طرف اربابِ علم و فضل کا یہ حال تھا (الا ماشاء اللہ) دوسری طرف "اہلِ نظر و سلوک" ان سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ عملی میدانوں میں۔ الفاظ سے ہی بحث سہی۔ کسی سند و دلیل کی تو ضرورت تھی۔ لیکن اس وادی میں ان تمام "ظواہر" سے بے نیازی ہوگئی۔ ان کا ذاتی کشف سب سے بڑی سند۔ اور سینہ بہ سینہ رموز سب سے بڑی دلیل تھی۔ اسلام کے زندہ دور میں میدانِ جہاد میں شمشیر بکف نکل کھڑے ہونا۔ بلند ترین عملِ صالح تھا۔ لیکن اب زاویہ کے گوشۂ خمول میں نفس کشی سب سے بڑا جہاد تھا۔ پہلے سیر و فی الارض مسلمان کے لئے ایک اہم فریضہ تھا۔ لیکن اب یہ تمام مراحل اپنے حجرہ میں بیٹھے مراقبہ کے ذریعے طے ہوجاتے تھے۔

یہ تمام منازل ایسے تھے جن میں قوم کی فعال قوتیں ایک ایک کر کے سپردِ خاک ہوگئیں اور وہی جماعت جس کی ضربِ کلیمی سے ایک دنیا کانپتی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ناکارہ بن کے رہ گئی۔ اس عجمی تصوف کے مختلف شعبوں میں وہ بنیادی مسئلہ جس نے پوری کی پوری قوم پر عملاً موت طاری کر دی۔ وحدتِ وجود کا عقیدہ تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول و طویل ہے۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس عقیدہ کی رُو سے وجودِ حقیقی صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اور کائنات کی ہر شے جس میں عالمِ طبیعی اور انسان سب شاملِ ہیں موہوم وجود رکھتے ہیں۔ لہٰذا۔ یہ دنیا سراب ہے، دھوکا ہے "مایا کا کھیل" کائنات موہوم ہے۔ نفسِ انسانی بے حقیقت ہے۔ زندگی

بے ثبات۔ لہٰذا سعی و عمل لاحاصل ہیں۔ دُنیا کی تمام تکالیف آرزو سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے ترکِ آرزو اور ترکِ علائق میں ہی حقیقی اطمینانِ قلب ہے۔ یہ تھا وہ فلسفۂ حیات جس نے ایک جیتی جاگتی قوم کو مردوں کی بستی بنا دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھ لیا کہ اب

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

اس وحدت وجود کے عقیدہ کے سب سے بڑے علمبردار شیخ اکبر ابن عربی ہیں۔ اسوقت اس عقیدہ کی جزئیات پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے فرصت درکار ہے۔

سردست انھی اشارات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی تردید میں اکثر ائمہ علوم نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن جنھوں نے بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت کی وہ امام سرہندی۔ شیخ احمدؒ ہیں۔ جنھیں عام طور پر "مجدد الفِ ثانی" کہا جاتا ہے۔ ان کے مکتوبات۔ ایک تو فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے۔ اور دوسرے اس لئے کہ وہ بڑے دقیق مسائل پر مشتمل ہیں۔ آج بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بالخصوص ہمارا نوجوان طبقہ تو ان سے قطعاً ناآشنا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی نے زیرِ نظر کتاب میں شیخ اکبرؒ اور امام سرہندیؒ کے نظریوں کا موازنہ کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امامؒ نے اس عقیدہ کا کس طرح ابطال کیا ہے ان کی یہ کوشش (بالخصوص انگریزی زبان میں) یقیناً قابلِ قدر ہے۔

ہر چند کتاب مختصر سی ہے اور اس میں تفصیلی مباحث کے بجائے محض اشارات ہی تک اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن "پہلی کوشش" ہونے کی جہت سے۔ بہرحال غنیمت ہے۔ ضرورت تھی۔ کہ اس عقیدہ کا عملی پہلو زیادہ نمایاں کیا جاتا اور تاریخی پس منظر کے ساتھ دکھایا جاتا کہ اس نے مسلمان کے قوائے عملیہ پر کیا اثر کیا۔ اور جناب امام سرہندیؒ کی اصلاح نے کیا نتیجہ پیدا کیا۔ یہی وہ کمی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب نظری سا مقالہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور اس میں وہ رُوح نظر نہیں آتی جو برقِ تپاں بنکر اس کے رگ و پے میں دوڑنی چاہئے تھی۔ مبتدیوں کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی۔ اور (جرأت عرض معاف کی جائے تو) ہمارا خالص انگریزی داں طبقہ ان امور میں مبتدیوں سے زیادہ حیثیت بھی کیا رکھتا ہے۔ دو ایک مقام وضاحت طلب بھی ہیں۔ صفحہ پر تحریر ہے۔

"(حضرت) شیخ احمدؒ کی مسئلہ وحدت وجود کی مخالفت فلسفیانہ دلائل یا

دینیاتی عقائد پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کشف یا براہِ راست مذہبی تجربہ پر
مبنی ہے۔"

اس کی تفصیل صفحات ۸۲-۸۳ پر بھی ملتی ہی۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس عقیدہ کا ابطال تصوف ہی کے تجارب کی بناء پر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کشف سے محسوس کیا کہ وحدت وجود بہت نچلی منزل ہی اور وہ خود ایک بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جسے ظلّیت کہا جاتا ہی۔ لیکن صفحہ ۱۱۷ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہی۔

"حضرت مجددؒ نے توحید کا جو تصور پیش کیا وہ یہ ہے کہ ہم خدا کو کشف و شہود کی رو سے نہیں پہچان سکتے۔ اس لئے ہمیں وحی اور علمائے ظاہر کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کا تصور براہِ راست وحی سے ماخوذ ہے۔ اس لئے حضرت مجددؒ ذات و صفات سے متعلقہ مسائل پر علمائے دین کے اصولوں پر بحث کرتے ہیں۔ اور اس باب میں وہ اشعری فریقِ فکر کی پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ ماتریدی کی تقلید کرتے ہیں۔"

ان دونوں چیزوں میں توافق نظر نہیں آتا۔ حضرت مجددؒ کی وحدتِ وجود کی مخالفت یا تو کشف و شہود پر مبنی ہو سکتی ہی یا دلائل و براہین پر۔ دونوں چیزیں ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتی ہیں اگر ان کی تردید کشف پر ہی مبنی ہی۔ تو جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہی یہ نہ تو فریقِ مخالف کے لئے حجت ہو سکتا ہی نہ متلاشیانِ حقیقت کیلئے سند۔ دلیل و حجت تو وہی چیز ہو سکتی ہی جس کی سند قرآنِ کریم سے لائی جائے۔ مثلاً خواجہ میر ناصرؒ کے طریقۂ محمدی کے متعلق اس کتاب میں تحریر ہی

"خواجہ میر ناصر۔ جو تصوف میں سلسلۂ مجددیہ سے متعلق ہیں ایک مرتبہ ایک ہفتہ تک عالمِ سکر میں رہے۔ اس دوران میں امام حسنؓ بذاتِ خود ان کے حجرہ میں تشریف لائے اور انھیں تصوف کے ایک نئے طریق کی تلقین کی اور ارشاد فرمایا کہ اس کا نام طریقۂ محمدی رکھا جائے۔ کیونکہ وہی طریقۂ جناب رسولِ خدا کا سچا طریقہ تھا۔"

ظاہر ہی کہ یہ چیزیں بطور سند و حجت کے تو پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اگرچہ تصوف کی تمام عمارت ہی ان ہی چیزوں پر قائم ہے۔ کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔

ایک جگہ عبد اور معبود کا ترجمہ (Worshipper and Worshipped) کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے۔ یعنی عبد۔ پرستش کرنیوالا۔ معبود۔ جسکی پرستش کی جائے۔ لیکن "پرستش" سے عبودیت کا قرآنی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ عبودیت کے صحیح معنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے (اور عبادت اسی تسلیم حاکمیت کا عملی مظاہرہ ہے) اس لئے عبد و عابد کے معنی محکوم، اور معبود کے معنی حاکم مطلق۔ قرآنی مفہوم کو زیادہ واضح کرتے ہیں۔ اسطرح اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنی ہونگے۔ "ہم تیرے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے"

کتاب شیخ محمد اشرف صاحب نے شائع کی ہے۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ عام کتابی تقطیع۔ مجلد کی قیمت تین روپیہ فی نسخہ۔

۲۔ انگریزی ترجمہ اسرارِ خودی

حضرت علامہ کی شہرۂ آفاق کتاب۔ اسرارِ خودی۔ کا انگریزی میں ترجمہ ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نکلسن نے کیا تھا جسے مغرب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پروفیسر نکلسن نے خود حضرت علامہ سے دریافت فرمایا تھا کہ ان کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور تفصیلی نظام کیا ہے۔ کیونکہ انھیں اعتراف تھا کہ

"مغربی قارئین۔ اسرارِ خودی کے مطالعہ سے بعض مقامات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور کوئی ترجمہ ان مقامات کا صحیح حل پیش نہیں کر سکتا۔"

حضرت علامہ نے پروفیسر نکلسن کے استفسارات کا تفصیلی جواب تحریر فرمایا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ۱۹۲۱ء کے ترجمہ کے شروع میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کوشش کے باوجود اس ترجمہ میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور اکثر مقامات پر ان کی نوعیت ایسی تھی کہ اصل مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ شیخ محمد اشرف صاحب تاجر اسلامی لٹریچر لاہور نے اس کتاب کا جدید ایڈیشن شائع کیا ہے۔ جسمیں ایسی ادبی غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے۔ جو پہلے ایڈیشن میں مختلف مقامات پر نظر آتی تھیں۔ پہلا ایڈیشن قریب قریب نایاب تھا۔ اس جدید ایڈیشن سے یہ کتاب پھر اربابِ ذوق کے لئے سہل الحصول ہوگئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جیسا کہ پروفیسر نکلسن کو خود اعتراف ہے۔ حضرت علامہ کے پیغام کی روح کو اہل مغرب بمشکل سمجھ سکتے ہیں۔

اس لئے ترجمہ میں اصل کی خوبی کہاں آسکتی ہے۔ لیکن انگریزی داں طبقہ کے لئے یہ ترجمہ مغتنمات میں سے ہے۔ جدید ایڈیشن کی طباعت۔ ٹائپ۔ کاغذ۔ جلد۔ نہایت عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ تین روپیہ

۳۔ جدید جغرافیہ پنجاب

طنزیہ تنقید نگاری، فنِ صحافت کی نازک ترین صنف ہے۔ اس لئے مشکل ترین بھی۔ اور ابھی اس اسلوب تنقید سے قریب قریب ناآشنا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہادے ہاں مزاح اور تمسخر میں تفریق ہی بمشکل کی جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب اس باب میں شاید اولیں کوشش ہے۔ جسے بڑی حد تک کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ شیرازہ کے مدیر احسان کے سابقہ مطایبات نگار "سندباد جہازی" نے پنجاب کی سیاست کو جغرافیہ میں اور جغرافیہ کو ظرافت میں کچھ اس خوبی سے سمویا ہے کہ ہنستے ہنساتے تنقید کے گہرے نشتر ٹھیک نشانہ پر لگتے چلے جاتے ہیں۔ سیاست اور پھر پنجاب کی پُرپیچ و خم سیاست کو جغرافیہ کے خشک و محدود موضوع میں پیش کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن "جہازی" صاحب نے اس موضوع کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے اور صرف الفاظ کی خوبی ہی نہیں، بلکہ اس نقاب پوش سیاست کو بڑی جرأت اور آزادی سے بے نقاب کیا ہے۔ البتہ "سکندر مونٹ" کے مرکزی سلسلہ کی حقیقت ابھر کر سطح پر نہیں آسکی۔ غالباً یہ اس لئے کہ یہ جغرافیہ اس کوہسار کے دامن میں بیٹھکر لکھا گیا ہے۔ اگر انک کے بار یا جزا سے ادھر بیٹھکر لکھا جاتا تو شاید اس سلسلہ کی طلسماتی وادیاں اور بھیانک غاریں زیادہ وضاحت سے سامنے آجاتیں۔ بہرحال کتاب بڑی دلچسپ اور مفید ہے۔ چونکہ سیاسی جغرافیہ جلد جلد بدل جانے والی چیز ہے۔ اس لئے اس میں ہر سال ترمیم و تنسیخ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ ہر سال اس کا جدید ایڈیشن چھپنا ضروری ہوگا۔ دو ایک جگہ پر عُریانیت غالب آگئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ کتاب اردو اکیڈیمی لوہاری گیٹ۔ لاہور کی طرف سے شایع ہوئی ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۴۲ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ فی نسخہ

۴۔ گلبانگ حیات

یہ کتاب بھی اردو اکیڈیمی۔ لاہور نے شایع کی ہے۔ سیالکوٹ کے ایک صاحب خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال ہیں جو امین حزیں تخلص فرماتے ہیں۔ زیر نظر کتاب انہی کے منظومات کا مجموعہ ہے۔ انہیں

حضرت علامہ اقبالؒ سے ہم وطن اور ہم اُستاد ہونے کی نسبت حاصل ہی۔ اور غالباً اس جہت سے اُنھوں نے تصور کر لیا کہ وہ حضرتِ علامہؒ کے رنگ میں خوب لکھ سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی چال بھی بھول گئے۔ چنانچہ یہ کتاب حضرت علامہؒ کی کتابوں کی تقطیع اور انداز پر شائع ہوئی ہی۔ عنوانات بھی ان سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً افکار۔ مقامات شعور و وجدان۔ رہے نام اللہ کا۔ جہان خویش۔ ستارۂ صبح۔ واردات۔ آرزو۔ مقام محمود۔ لاالہ الا اللہ۔ نکات۔ معارف۔ تقدیر۔ توانینِ خودی۔ شانِ انسان۔ رازِ کائنات۔ مکالمۂ شیطانؑ باری تعالیٰ۔ مقام مرد مومن وغیرہ۔ لیکن عنوانات کے لفظی اشتراک کے علاوہ حضرت علامہؒ اور جناب امین حزیں کے کلام میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ اشتراک تو ایک طرف ان میں کسی قسم کی باہمی نسبت ہی نہیں۔ جناب امین حزیں نے جو کچھ اور جل لکھا ہی۔ انسے تو چھوڑیئے حضرت علامہ کی ایک مشہور غزل کا منظوم مفہوم بھی گلبانگِ حیات میں شامل ہی اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ ان ہردو حضرات کے کلام میں کیا نسبت ہے۔ چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں۔

حضرت علامہ بادمے نرسیدی۔ خدا چہ می جوئی — زخود گریختہ۔ آشنا چہ می جوئی

امین حزیں آدمی بن آدمی پہلے خدا مل جائیگا — آپ اپنا آشنا ہو۔ آشنا مل جائیگا

حضرت علامہ دو قطرہ خونِ دل است انچہ مشک می نامند — تو اے غزالِ حرم در خطا چہ می جوئی

امین حزیں خون دل ہی کے دو قطرے ہیں جنھیں کہتے ہیں مشک — تجھ کو اے آہو حرم ہی میں خطا مل جائیگا

حضرت علامہ نظر ز صحبتِ روشندلان بیفزاید — ز درد کم بصری توتیا چہ می جوئی

امین حزیں عقل کے اندھے کہیں سے ڈھونڈھ روشن دل کوئی — اس کے ہاں سے تجھ کو تیرا مدعا مل جائیگا

حضرت علامہ قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است — زما نگاہِ طلب۔ کیمیا چہ می جوئی

امین حزیں میں قلندر ہوں جہاں بینی کرامت ہی مری — جز نگہ تجھ کو ہوس مجھ سے کیا مل جائیگا

یا مثلاً حضرت علامہ کا مشہور شعر ہی۔

عمل سے زندگی بنتی ہی جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہی نہ ناری ہی

جناب آمین حزیں ۔ تقدیر کے عنوان کے ماتحت ایک قطعہ میں فرماتے ہیں

فلک کو کوستے ہیں نالۂ شبگیر کرتے ہیں ۔۔۔ جو پاداشِ عمل پہ شکوۂ تقدیر کرتے ہیں
مکافاتِ عمل کا مسئلہ مشکل نہیں اتنا ۔۔۔ یہ جنت ہو کہ دوزخ ہو ہمیں تعمیر کرتے ہیں

جناب آمین حزیں تو اس کتاب کی اشاعت میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ انسان کے لئے اپنا آپ نقاد ہونا بہت مشکل ہی اور ایک شاعر کے نزدیک اپنا کلام "الہام" کی حیثیت رکھتا ہی۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کتاب کے مقدمہ نگار۔ جناب سر عبد القادر صاحب پر۔ جنھوں نے جناب امین حزیں کو ان کے کلام کی معنوی حیثیت سے آگاہ نہ کیا۔ اُنھیں چاہیے تھا کہ جناب امین حزیں کو بتاتے کہ اقبال کا رنگ اس چیز کا نام نہیں کہ جو الفاظ اُنھوں نے استعمال فرمائے ہیں۔ اُنھیں اُلٹ پھیر کر اکٹھا کر دیا جائے بلکہ اقبال کی "شاعری" ہماری شاعری سے بالکل جداگانہ چیز ہے اور اُن کا رنگ اُسی کے مقام پہ پہنچ کر حاصل ہو سکتا ہی اور یہ آسان بات نہیں۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہی چمن میں دیدہ ور پیدا

کتاب بڑی عمدہ چھپی ہی۔ بڑی خوبصورت جلد۔ جس پر طلائی حروف میں نام بھی لکھا ہی جلد کی حفاظت کے لئے باریک گرد پوش بھی ہی۔ قیمت دو روپیہ فی نسخہ ہے۔

۵۔ قولِ احسن چالیس صفحہ کا ایک چھوٹا سا پمفلٹ۔ جس میں قرآن کریم کی روشنی میں بتایا گیا ہی کہ ہماری فرقہ بندی کس قدر غیر اسلامی ہی۔ مضمون غازی رحمت اللہ صاحب جالندھری کا لکھا ہوا ہی۔ جس کے آخر میں محمد اقبال سلمانی صاحب نے چار صفحہ کے تتمہ کا اضافہ کیا ہی۔ ۲؍ میں دفتر اُمتِ مسلمہ۔ امرتسر (پنجاب) سے مل سکتا ہی۔

۶۔ علم حدیث حدیث کے متعلق علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کا مضمون جو طلوعِ اسلام میں چھپ چکا ہے اور جس کا الگ پمفلٹ بھی شایع کیا گیا ہی۔ اُمتِ مسلمہ امرتسر نے پمفلٹ کی شکل میں شایع کیا ہی۔ قیمت درج نہیں ہی۔

۷۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا انسائیکلو پیڈیا۔ یا دائرۃ المعارف۔ ایک ایسی جامع کتاب کو کہتے ہیں جسمیں علوم و فنون کے متعلق معلومات ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع ہوں۔ اگرچہ اس قسم کی کتابوں کی ابتدا بھی مسلمانوں کی

لیکن آج ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اسلام کے متعلق دائرۃ المعارف کسی اسلامی ملک یا مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے شایع نہ ہوا۔ بلکہ یورپ کے مستشرقین کی ایک جماعت نے برسوں کی محنت کے بعد "انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام" شایع کیا۔ یہ انسائیکلو پیڈیا بالاقساط شایع ہوتا رہا اور ایک عرصہ کے بعد تکمیل کو پہونچا۔ اور اس میں شبہہ نہیں۔ کہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے۔ دورِ حاضرہ میں یہ اپنی قسم کی ایک ہی کتاب ہے۔ اگرچہ۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ مستشرقین مغرب کی لکھی ہوئی ہے جو کتنے ہی بالغ نظر اور وسیع النظر ہونیکے مدعی ہوں۔ اسلام کے متعلق ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں۔ کوئی نہ کوئی کانٹا مزور ہوگا۔ اور اگر کہیں ایسا نہ بھی ہو۔ تو بھی ان کی تحریریں اسلام کی صحیح رُوح سے عاری مزور ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام پر اعتماد کلی تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بایں ہمہ۔ اس میں معلومات کا ایک بحرِ بیکراں موجود ہے۔ ہماری نگاہیں مصر کے ارباب علم و فضل پر تھیں کہ وہ اپنے طور پر اسلامی دائرۃ المعارف لکھیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ انھوں نے اسی دائرۃ المعارف کے ترجمہ پر اکتفا کر لیا ہے۔ اور کہیں کہیں حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔ جب مصر والوں کی یہ حالت ہے کہ انھیں از خود دائرۃ المعارف لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تو ہندوستان میں اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ یہاں تو اتنی بھی اُمید نہ تھی کہ اس کا ترجمہ ہی ہو جائے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جناب محمد عبدالمغیث صاحب نیموی نے اس کی ہمت کی اور اس ضخیم کتاب کا مسلسل ترجمہ شروع کر دیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ شروع میں ہر دو ماہ کے بعد سو صفحہ کا ایک حصّہ شایع کر دیا جائے۔ بعد میں اسے ماہانہ بھی کر دیا جا سکتا ہے۔ حصّہ اول ہمارے سامنے ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ۔ مصر کے حواشی۔ اور بعض مقامات پر مزید اضافے اسمیں شامل ہیں۔ ہم جناب نیموی صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ دو تین اُمور کو مزور پیش نظر رکھیں (۱) ترجمہ کرتے وقت عربی ترجمہ کے علاوہ اصل انگریزی بھی سامنے رہے۔ اور اصل کتاب میں جہاں جہاں جو چیز کھٹکتی نظر آئے وہاں وضاحت سے اس کی تردید کی جائے۔ اور اگر مزورت ہو تو اس کے متعلق دیگر ارباب علم و فضل سے بھی استصواب کر لیا جائے (۲) کاغذ ذرا مضبوط لگایا جائے اور متنِ کتاب میں

کوئی اشتہار نہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ ماہانہ رسالہ نہیں۔ بلکہ ایک مستقل کتاب ہے (۴) کتابت اور صاف ہونی چاہئے اور ترتیب میں وضاحت۔

ارباب ذوق سے درخواست ہے کہ وہ اس اقدام کا خیر مقدم کریں اور اس کی اشاعت میں مقدور بھر کوشش کریں تاکہ یہ عظیم الشان کام اختتام تک پہنچ جائے ہمارے سامنے اس کا پہلا حصہ ہے جو جولائی سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ قاعدہ کے مطابق اس وقت تک اس کے بعد تین حصے اور شائع ہو جانے چاہئے تھے۔ معلوم نہیں وہ شائع ہی نہیں ہوئے یا ہم تک نہیں پہونچے۔ قیمت فی حصہ ۸؍ سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ناشر۔ جدید پریس۔ بیگم پور۔ پٹنہ سٹی۔

۸۔ دانائے راز

جذبات عقیدت جو جناب آغا نیر احمد خاں خاموش نے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں صفحۂ قرطاس پر جمع کئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے محبت کے آنسوؤں کا صحیح مقام گوشۂ تنہائی ہے۔ نمناک آنکھوں کو سرِ محفل لانا۔ ضبط محبت کی آبرو پر حرف لے آتا ہے۔

غم دل گفتہ بہتر ہمہ کس جگر نہ دارد

دوسروں کے لئے وہی چیز وجہ دلکشی ہو سکتی ہے جس میں ان کے لئے افادیت کا کوئی پہلو نمایاں ہو۔ ۵۲ صفحہ کی کتاب (بلا جلد) ۱۲؍ میں دائرۃ الادب اردو لودیانہ (پنجاب) سے مل سکتی ہے۔ جناب مصنف ارباب عقیدت میں تحفۃً پیش کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔

۹۔ تعلیمات اقبال

حضرت علامہؒ کے وفات کے بعد ان کے کلام اور سیرت کے متعلق بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک کوئی معیاری کتاب سامنے نہیں آئی۔ زیر نظر کتاب سے توقع تھی کہ شاید اس کمی کو پورا کر دے۔ لیکن اس سے بھی صرف اتنا ہی ہو سکے گا کہ جن لوگوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ ان کے لئے ابتدائی تعارف کا کام دے۔ اصل کتاب سے زیادہ اچھا وہ مختصر سا چھ صفحہ کا پیش لفظ ہے جو جناب عبد المجید صاحب سالک نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ مولف کتاب۔ پروفیسر محمد یوسف سلیم چشتی۔ نے دیباچہ میں لکھا ہے

کہ ان کا ارادہ ہے کہ اس قسم کی دس ایک کتابیں اور بھی لکھیں گے۔ ہم جناب سالک کیساتھ اس دعا میں شریک ہیں کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر صاحب کے سینہ کو فہم حقائق کے لئے کھولدے۔

ہم نے نقد و نظر کے شروع میں لکھا ہے کہ مسلمانان ناشرین کی طرف سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی قیمت بالعموم بہت زیادہ رکھی جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب اسکی زندہ مثال ہے۔ عام سائز کے ۱۲۵ صفحہ کی کتاب اور بلا جلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اگر حضرت علامہؒ کے نام کو بیچنا نہیں تو اور کیا ہے۔ حضرت علامہ پرانے زمانے میں ہوتے تو لوگ قبر کے مجاور بنتے۔ اس روشنی کے زمانہ میں مجاوری کی یہ جدید شکل پیدا ہو گئی ہے۔

نئے جال لائے پرانے شکاری

کتاب اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور سے مل سکتی ہے

رسید کتب

مطالعۂ حدیث۔ تنقید صحیح کی روشنی میں۔ از سید مقبول احمد صاحب بی، اے۔ شائع کردہ "امت مسلمہ امرتسر"۔ قیمت عمر

رسائل

سیاست:۔ ہمارے ہاں ایسے رسائل کی بہت کمی ہے۔ جن میں اعلیٰ پایہ کے تحقیقاتی مضامین شائع ہوں۔ زیر نظر رسالہ اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔ سہ ماہی رسالہ ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ جو اسے نہایت سلیقہ سے ترتیب دیتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ اعلیٰ پایہ کے مضامین شائع ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ ابھی اچھا لکھنے والوں کی کمی ہے۔ اس لئے ہر مضمون ایک ہی پایہ کا نہیں مل سکتا۔ بایں ہمہ جو اہل ذوق علمی۔ تحقیقاتی مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے یہ رسالہ قابل قدر ہے۔ اس ضمن میں ہم رسالہ کے ارباب حل و عقد سے ایک درخواست ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ تحقیقات کے میدان میں "فی وادی یھیمون" کے بجائے ایک خاص نصب العین کے ماتحت تحقیقاتی مضامین شائع

کئے جائیں۔ اور یہ ظاہر ہی کہ ایک اسلامی رسالہ کے لئے قیامِ حکومتِ الٰہیہ سے بڑھکر اور کونسا نصب العین موزوں تر ہو سکتا ہی۔ ہم نے اس مشورہ کی جرأت اس لئے بھی کی ہے کہ اس باب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے خیالات نہایت پختہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مضمون ۔طلوعِ اسلام کی اشاعت رواں میں بھی شائع ہو رہا ہی۔ طباعت ۔کتابت۔ کاغذ عمدہ ۔ ناشرین ۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز۔ چار مینار حیدرآباد (دکن) سے بہ قیمت ۸؍ فی پرچہ اور پانچروپیہ سالانہ مل سکتا ہی۔

لمعات

اشاعت زیر نظر میں "حقائق و عبر" بھی شامل نہ ہو سکے۔ اور "لمعات" کے تحت بھی اختصار سے زیادہ کچھ نہیں لکھا جا سکا۔ اس کمی کا ہمیں افسوس ہے۔ لیکن اس ماہ کچھ ایسے معاملات سامنے آگئے کہ ہم ان عنوانوں کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ اپریل میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان ہر دو عنوانوں پر تفصیلاً لکھا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور یوں اشاعت رواں کی کمی آیندہ پرچہ میں پوری ہو جائے گی۔

فروری کی اشاعت میں "قیاس کن توکجائی ومن کجا واعظ" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا۔ اسے خاص طور پر قبولیت حاصل ہوئی۔ بعض احباب نے لکھا ہے کہ اس کا کوئی مختصر سا عنوان تجویز کر کے اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے۔ سردست اس فرمائش کی تعمیل مشکل ہے۔ البتہ جو احباب اس کی اشاعت چاہتے ہوں۔ وہ فروری کا پرچہ طلب فرماویں جو نصف قیمت (۴ر) میں بھیجدیا جائے گا۔ حوالہ کے لئے ازدواجی حکومت لکھدینا کافی ہوگا۔

معارف القرآن کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اکثر احباب نے مختلف تجاویز ارسال فرمائی ہیں جن کے لئے ہم ان کے بصمیم قلب سپاس گذار ہیں۔ کتاب کی اشاعت کے وقت انشاء اللہ ان تجاویز کو زیر نظر رکھا جائے گا۔

ہفتہ میں دوبار
جدت مرادآباد

جدت ہندوستان کا بہترین ستا اور کثیر الاشاعت خبار ہے

خریداری کیلئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیراعظم بنگال۔ آنریبل سر سکندر حیات خان وزیراعظم پنجاب۔ راجہ صاحب محمودآباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپلیں شائع کی ہیں

جدت دلکش نظموں بہترین جنگی تبصروں بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ

اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے۔

خبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے بلکہ پرانا ہے اسکی تیرھویں جلد ہے اس اخبار کی

یڈیٹری کیلئے ملک کے ایک ایسے مایہ ناز اہل قلم و انشاپرداز گریجوٹ کی خدمات

حاصل کی گئی ہیں جو کئی روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کر چکے ہیں۔

چندہ کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور ۱۲؍ ششماہی در سہ ماہی مقرر کی ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرماکر جاری کرالیں ایجنٹ صاحبان کو پچیس فیصدی کمیشن دیا جاویگا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیرالاشاعت ہے اسلئے مشتہرین کیلئے بہت منفعت بخش ہے

مینیجر

اخبار جدت مرادآباد پریس روڈ

مضامین و خطوط محمد علیؒ

قوم زندہ ہوتی تو محمد علی اسوقت پوج رہے ہوتے۔ اُن کی تحریر کا ایک ایک لفظ محفوظ اور ملّت کے نوکِ زبان ہوتا۔ اب تو سرور صاحب کا یہی احسان بہت ہے کہ اُنھوں نے زحمت گوارا کر کے ہمدرد کے فائلوں کو پڑھا اور محنت کر کے ان میں سے انتخابات کئے پھر اُنھیں خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،

یہ کتاب اس مجسمہ کرم، اسلام کے عاشق، ملک و قوم کے شیدا۔ سیاست کے ماہر، علوم مشرقی و مغربی کے فاضل اور نڈر مجتہد کے لاجواب مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کے مرتب پروفیسر محمد سرور صاحب ہیں۔

جناب رازق الخیری صاحب

پروفیسر محمد سرور صاحب نے یہ ایک بڑی خدمت انجام دی ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین مرتب کئے۔ ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے۔ مگر محمد علی اس کا دل تھا اور بڑا ہی متحرک۔ ہم اسکی تحریروں میں اسکی شخصیت کو بالکل بے پردہ دیکھ سکتے ہیں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مضامین محمد علی۔ حصّہ اول۔ قیمت عہ
" " حصّہ دوم " عہ
خطوط محمد علی ..... عہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، دہلی

مقدمۂ زندگانی محمدؐ
عہدِ حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانی محمدؐ" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے۔ اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہوگئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہوگئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوئی۔ اب دفتر اُمتِ مُسلمہ امرت سر نے مقدمۂ "زندگانی محمدؐ" کا اُردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبرِ اسلام کی مقدس زندگی پر اہلِ مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلّل اور معقول جواب دیے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابلِ قدر تالیف ہے۔ (اعلیٰ حضرت فرماں روائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمدؐ کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا۔ (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ۔ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ، دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے مصنف کی کوششیں مستحقِ اجر و قابلِ داد ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ اس کتاب میں کلام اللہ کی صحت کے اہتمام، اس کی تدوین کی تاریخ اور مستشرقین کی تحقیقات کے بارہ میں مفید معلومات ہیں۔ (معارف)

۶۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانی محمدؐ) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

۷۔ کتاب کا اصل مقصد سیرتِ نبویؐ سے مستشرقین کے بعض الزامات کو رفع کرنا ہے اور اس مقصد میں مصنف کو خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ (صدق)

۸۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ (شاعر)

۹۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ (جامعہ)

۱۰۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو اہلِ مغرب کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُن کے لیے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایتِ اسلام)

لکھائی چھپائی اور کاغذ ستھرا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے۔ ۱۴ ٹکٹوں کی صورت میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ: **دفترِ اُمتِ مُسلمہ۔ امرت سر** (پنجاب)

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

ازجناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدن و معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب اس کے دنیاوی معاملات اپنوں و بیگانوں سے اس کے تعلقات غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۳ر محصول ۱ر

ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینہ کے پرچے کے اندر ایک اطلاع جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے اور قیمت فی پرچہ ۸ر چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصول (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اسے موصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑئیے۔

(۱۱) "طلوع اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچہ کے لئے ۲ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم، ادارہ طلوع اسلام دہلی